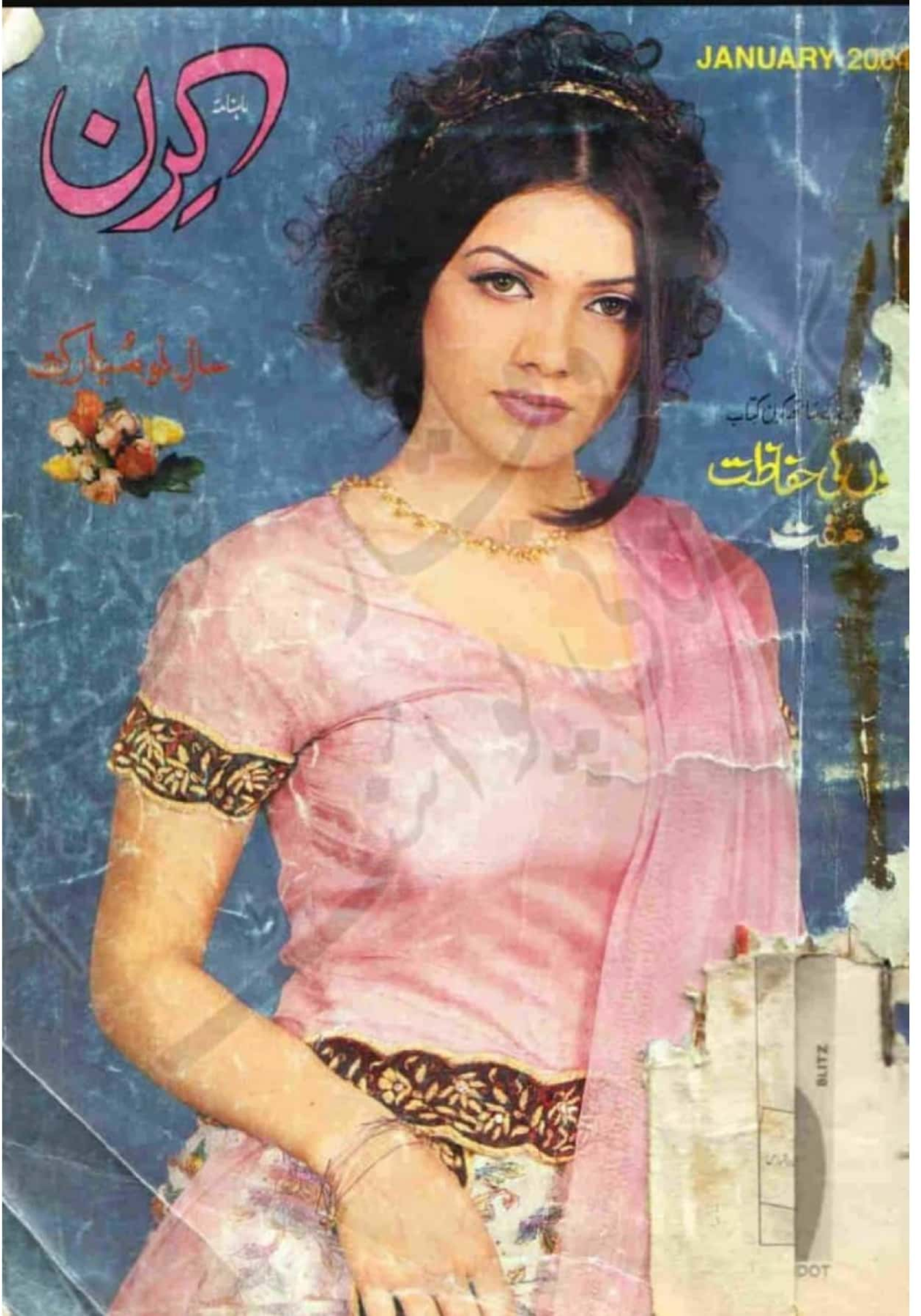
JANUARY 200
ماہنامہ
کرن
سال نو مبارک

فرح اسلام

digest novels lovers group ❤️❤️

لندن کے علاقے ہنسلو کے سب سے بڑے بازار ہائی اسٹریٹ میں بنے ہوئے ٹریٹ سینٹر سے خریداری کرنے کے بعد اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اسے گھر سے نکلے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو تھے۔ شاپنگ تو اس نے ہلکی پھلکی کی تھی محض ضرورت کی چند چیزیں اور ایک گرم جیکٹ جس کی اس کو اشد ضرورت تھی۔ تاہم یہ شاپنگ سینٹر ایسا تھا کہ اس کو دیکھنے کے لیے وہ دو گھنٹے مزید گنوا سکتا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ صمد چچا گھر میں بالکل اکیلے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا

ناولٹ

شاپنگ سینٹر سے باہر نکل آیا۔

"ٹوئنٹی گارڈنگ ٹن اسکوائر۔" اس نے ٹیکسی میں منہ ڈال کر کہا اور جواب مثبت میں ملنے پر ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ یہ ہنسلو کا رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں تعمیر تمام گھر ایک جیسے تھے۔ تمام گھر تقریباً" دو سو تین سو سال پرانے تھے۔ مگر یہاں کے مکین رنگ و روغن اور مرمت کے ذریعے ان گھروں کو ابھی تک جوان رکھنے میں کامیاب تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ گھروں کے ڈیزائن کے علاوہ رنگ بھی ایک جیسے تھے۔ گھروں کے آگے چھوٹے چھوٹے سے گارڈن جن میں گلاب کے بڑے بڑے پھول لگے ہوئے تھے۔ صمد چچا کے گارڈن میں سیب اور ناشپاتی کے درخت تھے جو وقتاً" فوقتاً" درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتیں۔ مگر انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس بات پر بڑا حیران ہوتا تھا پاکستان میں ان کے پڑوسی سلطان صاحب کے گھر میں لگے ہوئے بیری اور بادام کے درختوں پر دن و رات اتنے پتھر برستے تھے کہ اگر ان تمام پتھروں کو جمع کر لیا جاتا تو اب تک پتھروں کا پہاڑ بن جاتا۔ مگر یہاں کسی کو پرواہ ہی نہ تھی۔

خلاف توقع گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ قدرے حیران ہوتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ لیکن لونگ روم میں پہنچ کر اس کے قدم جم سے گئے۔

صمد چچا کے گھٹنوں پر سر رکھے زارو قطار روتی ہوئی یقیناً" وہ کوئی لڑکی تھی۔ جس کے سنہری بال پوری کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ دو زانو۔ بیٹھی اس لڑکی کا دایاں گلابی پاؤں جو باہر کی طرف نکلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں اضطرابی کیفیت میں مڑ اور کھل رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے صمد چچا کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور انہی پر سر رکھے وہ آنسو بہانے میں مشغول تھی۔ وہ جینز اور نیوی بلیو شرٹ میں کافی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس لڑکی کے ساتھ ہم اشک ہوتے ہوئے صمد چچا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جلدی سے لڑکی کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولے۔

"ورشا..... ورشا دیکھو فاز آ گیا۔ میرا بھتیجا۔ میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا نا۔ یہ لو وہ آ گیا۔" وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہے تھے۔

"اور فاز دیکھو میری بیٹی آ گئی۔ میری ورشا واپس آ گئی کبھی نہ جانے کے لیے۔" وہ ایک مرتبہ پھر روتے

ہوئے گویا ہوئے۔ ان کی بات سن کر اس کے دل پر منوں بوجھ آگرا۔

"اوہ ..... تو تم واپس آ گئیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ انجام تو حسب توقع تھا مگر اتنی جلدی .....؟ اس نے جبراً" تبسم ہونٹوں پر سجایا۔

"ہیلو ورشا۔ کیسی ہو؟"

جواب ندارد۔ وہ جوں کی توں بیٹھی سسکتی رہی۔

"ورشا ..... بیٹا فاز سے ملو۔ دیکھو یہ ہمارا اپنا خون ہے۔ میرے بھائی کی اولاد۔" انہوں نے بیٹی کا چہرہ اونچا کیا۔ جس پر روتی ہوئی ورشا نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

کچھ لمحے کے لیے تو فاز پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ اتنا مکمل حسن اس نے شاید پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ متواتر رونے کی وجہ سے اس کی ناک کا اوپری حصہ سرخ ہو رہا تھا۔ جبکہ سنہری آنکھیں سرخ اور سنہرے رنگ کا حسین امتزاج لگ رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نچلا خوب صورت ہونٹ دانتوں کے درمیان دبا کر چھوڑا تو لگا ابھی خون چھلک پڑے گا۔ وہ دوبارہ سر پہلے والی پوزیشن میں رکھ کر اپنا کام جاری کر چکی تھی۔

"سوری بابا میں بہت بری لڑکی ہوں، لیکن آپ مجھے

چھوڑیں گے تو نہیں پلیز بابا مجھے معاف کریں۔'' یہ ساری گفتگو وہ انگریزی میں کر رہی تھی اور روتے روتے صمد چچا کے ہاتھ تھام کر ان الفاظ کی بار بار گردان کر رہی تھی۔

اوہ.... تو محترمہ پوری کی پوری یہاں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اردو بھی نہیں آتی۔ فاز نے تلخی سے سوچا۔ مگر دوسرے ہی لمحے فاز کا خیال غلط ثابت ہوا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی بابا۔ کبھی بھی نہیں۔ بس آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''کر دیا.... میرے چاند۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ خطاوار صرف تم نہیں میں بھی تھا۔'' صمد چچا بیٹی پر محبتوں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے بولے۔ وہ ایک پل میں سب کچھ بھول گئے تھے۔ اس کی جدائی میں جو جانکاہ وقت انہوں نے گزارا تھا۔ اس وقت ان کے چہرے پر اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔

فاز نے حیران ہو کر صمد چچا کی طرف دیکھا۔ ابھی کل تک ان کے بیڈ روم سے سسکیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو انہیں چپ کراتے کراتے وہ خود دلگیر ہو جایا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ اس کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکی کو ڈھونڈ کر گھسیٹ کر لائے اور اس کو کمزور اور معذور باپ کی حالت دکھائے۔ اور پوچھے کیا اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا کہ تو یوں اپنی منہ زور جوانی کے قدموں تلے ان کے ارمانوں کو کچل کر چلی جائے۔ مگر یہ ساری باتیں وہ صرف سوچ کر رہ جاتا۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ورشا کو آئے ہوئے تیسرا دن ہو چلا تھا۔ مگر ابھی تک اس نے فاز سے کلام تو در کنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ فاز کو بھی اس بات کا کوئی قلق نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے اس طرح کی لڑکیوں سے سخت نفرت تھی جو زمانے بھر میں ماں باپ کے چہروں پر کالک مل کر انہیں بدنام کرا دیں۔ جو کارنامہ ورشا نے انجام دیا تھا اس کے سننے کے بعد تو اسے اس لڑکی سے گھن آنے لگی تھی۔ اس نے بارہا ورشا کو تنہائی میں سسکتے دیکھا مگر یہ سب فاز کو ڈھکوسلا لگتا۔ اسے اس بدکردار لڑکی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اگر ان دونوں کا سامنا بھی ہو جاتا تو فاز خود اسے یوں نظرانداز کر دیتا جیسے اس کے وجود سے ناواقف ہو' اور وہ بھی سر جھکائے یوں زمین کو گھورنے لگتی جیسے ابھی زمین سے کوئی دفینہ ابل پڑے گا۔ جس کی چمک کے آگے اس کے وجود کی ساری سیاہی ماند پڑ جائے گی۔ بے شک وہ بے حد حسین تھی۔ بلکہ حزن و ملال نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ مگر فاز کے نزدیک اب وہ ایک ایسا ہیرا تھا جو غلاظت کے ڈھیر میں پڑا تھا۔ جس میں سے اٹھتا تعفن اسے سو گز دور رہنے پر مجبور کرتا تھا۔

حالانکہ اس سارے واقعے میں اس کا اپنا وجود کسی طرح بھی ملوث نہیں تھا۔ مگر پھر بھی براہ راست اس کی ذات سے تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ بے حد دلبرداشتہ ہوا تھا۔ کچھ بھی سہی آخر وہ اس کی چچا زاد تھی۔ اس کے خاندان کی عزت۔ اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو شاید لوگوں کا سامنا بھی نہ کر پاتا۔ وہ تو شکر ہے وہ ایک ایسے دیس میں تھا جہاں اس طرح کے واقعات معمول کا حصہ تھے۔ دوسرے وہاں کوئی ایسا رشتہ دار' یا جان پہچان والا بھی نہ تھا جس کے سامنے زمین پر گری پگڑی اٹھانے کے لیے قدموں میں جھکنا پڑتا۔

جب سے فاز صمد چچا کے پاس آیا تھا ان کے تمام کاموں کی نگرانی اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ صمد چچا کے دو اسٹور تھے۔ جن کا کرایہ وہ باقاعدگی سے وصول کرنے جاتا۔ اس کے علاوہ گھر کا تمام سودا سلف وہ ہی لے کر آتا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اس نے ملازم کو بھی ہٹا دیا تھا۔ سارے کام وہ خود کرتا۔ فاز کے آنے سے صمد چچا کو خاصی سہولت ہو گئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ یہاں کی گورنمنٹ کی اسکیم —— سسٹم کے ذریعے کھانا گھر پر ہی منگوا لیتے تھے۔ لیکن جب سے فاز یہاں آیا تھا اس نے یہ ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اٹھالی تھی۔ وہ گزارے لائق کھانا بنا ہی لیتا تھا۔ لندن آنے کے بعد مسلسل

ڈیڑھ سال سے وہ خود ہی کھانا بناتا تھا۔ ظاہر ہے یہاں پردیس میں وہ کوئی نوکر تو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ صمد چچا کے پاس آنے سے پہلے وہ جس جگہ ملازمت کرتا تھا وہاں بارہ گھنٹے مسلسل کام کرنے کے بعد ہل کر پانی پینے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی پیٹ پوجا بھی تو کرنی ہوتی تھی۔ وہ صمد چچا سے صرف ملنے آیا تھا مگر صمد چچا نے یہاں آنے کے بعد اسے کہیں نہیں جانے دیا۔

"میں نے اپنے کام کے لیے جو ملازم رکھے ہوئے ہیں میں ان کی جگہ تمہیں ملازمت دے دیتا ہوں تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا۔ لیکن مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے تھے۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کتنی دیر تک لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ جب سے ورشا یہاں آئی تھی اس کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ الجھن محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یہاں سے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ اس کے دل نے مشورہ دیا۔ اک نامعلوم سی کسک نے پورے وجود کو گھائل کر رکھا تھا۔ صمد چچا کی حالت دیکھ کر وہ بہت دلگرفتہ ہوا تھا۔ یادوں کی کتاب میں رقم پچھلے ماہ و سال نیند کی جگہ آنکھوں میں براجمان ہو گئے کہ آنکھوں کی سیٹ خالی جو تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہم کسی ایک ناخوشگوار واقعے کو بنیاد بنا کر ساری زندگی کی خوشیوں اور آرزوؤں کو خود فریبی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ آخر آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا۔ نہ جانے یہ کیسی محبت ہے جو ایک انسان کو دوسرا انسان اپنے خود ساختہ وہمات اور اصولوں کی بھینٹ اس طرح چڑھا دیتا ہے جیسے خون کی ڈور سے بندھے ہونے کے عوض اس رشتے کی نسبت ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل تاوان کی صورت میں دوسرے پر لاگو ہونا ضروری ہے۔ گھر والوں کو سمجھا سمجھا کر وہ خود اعصاب شکن ہو رہا تھا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

"تم بھی لندن جا کر اپنے چچا کی طرح وہیں کے ہو جاؤ گے۔ وہاں مردوں کے پاؤں کی بیڑیاں بننے کے لیے بہت سے لوازمات ہیں۔ تمہارے چچا نے ہم سب کو انتظار کی سولی پر لٹکا کر چھوڑ دیا۔ مرے ہوئے کا صبر آجاتا ہے بیٹا مگر زندہ وجود کو بھلانا آسان نہیں ہوتا۔ ہم بار بار یہ دکھ نہیں اٹھا سکتے۔ جو بھی روکھی سوکھی یہاں ہے اسی پر خدا کا شکر ادا کرو۔ آج نہیں تو کل اللہ کوئی سبب پیدا کر دے گا وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔" انیسہ پھپھو نے آبدیدہ ہو کر لمبا چوڑا لیکچر جھاڑ دیا۔

"کون سے کل کا انتظار کروں۔ پانچ سال سے جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوں ملی نوکری؟ آپ نہیں جانتیں پھپھو اس ملک میں امیر امیر تر ہو رہا ہے اور غریب سے زندہ رہنے کا حق بھی چھینا جا رہا ہے۔ میں اگر یہاں رہا "نوکری" کے انتظار میں تو کل اوروں کی طرح میری تصویر بھی اخبار کی زینت بن جائے گی۔ "غربت سے تنگ آکر ایک گریجویٹ نوجوان نے خود کشی کر لی۔ مرحوم برسوں سے بیروزگار تھا۔" اس نے جل بھن کر باقاعدہ خبر والے انداز میں پڑھا تو انیسہ پھپھو نے جھٹ ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔

"خدا نہ کرے میرے بچے۔ کیسے بدفال منہ سے نکال رہا ہے۔ اللہ تجھے سلامت رکھے۔" وہ سچ مچ رو پڑیں۔

"پھپھو! میں امی کی ناراضگی کے ساتھ یہاں سے جانا نہیں چاہتا آپ ہی ہیں جو انہیں سمجھا سکتی ہیں کیا آپ نہیں چاہتیں کہ رابعہ یہاں آکر ایک خوشحال اور من چاہی زندگی گزارے۔ کیا ہمارا ان آسودگیوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ رابعہ یہاں آکر اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹے۔" اس نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں جوں ہی میرے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ میں یہاں آکر چھوٹا موٹا کاروبار کر سکوں میں واپس آجاؤں گا۔ آپ لوگ مجھ پر اعتبار تو کریں۔ میں صمد چچا نہیں ہوں۔"

"میرے بچے" انیسہ پھپھو نے اسے گلے سے لگا

لیا۔

٭ ٭ ٭ ٭

وہ زندگی میں پہلی مرتبہ گھر سے اتنا دور ہوا تھا۔ اجنبی دیس، اجنبی لوگ، ابھی تو اسے آئے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے ابھی وہ ایئرپورٹ کی حدود میں ہی تھا اور ابھی سے وہ یہاں شناسا چہرے ڈھونڈنے میں اپنی آنکھیں تھکا رہا تھا۔ وہ اپنی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنس دیا تھا۔

بعض اوقات یہ اجنبیت کی دیواریں بھی کتنی اونچی ہو جاتی ہیں کہ لاکھ کوششوں کے باوجود دیوار کے پار دیکھنے کی سعی میں برسوں کی سی تھکن چکنا چور کر دیتی ہے۔ مگر یہ دیواریں رستہ بھی نہیں دیتیں۔ وہ اپنے ایک دوست کے دیے ہوئے ایڈریس پر سیدھا ساؤتھ ہال پہنچا۔ جہاں اس کے دوست شارق کے ماموں رہائش پذیر تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور با آسانی اسے مطلوبہ ایڈریس پر لے کر پہنچ گیا۔ شارق کے ماموں زبیر احمد بیس سال سے لندن میں مقیم تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی بیگم بھی بہت اچھی خاتون تھیں۔ ان دونوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ چند دن ان کے ساتھ رہا پھر انہوں نے ہی اسے ایک جگہ ملازمت دلوادی۔ ملازمت ملتے ہی وہ کرائے کے گھر میں شفٹ ہو گیا۔ وہ صبح سات بجے کام پر جاتا اور شام سات بجے تک مسلسل وہاں کام کرتا۔ تاہم مہینے پر ملنے والی تنخواہ جو کہ پاؤنڈ کی صورت میں ہوتی تھی اس کا ڈھیروں خون بڑھادیتی۔

وہ بہت محنت سے پیسہ جمع کر رہا تھا۔ لیکن اپنی اس مصروفیت میں بھی وہ دادی کی ہدایت نہیں بھولا تھا۔ انہوں نے بڑی تاکید سے صمد چچا کا پتہ کروانے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے صمد چچا کا جو آخری خط اس کے حوالے کیا تھا اس میں دس سال پہلے کی تاریخ درج تھی۔ خط میں ایڈریس کے ساتھ ساتھ فون نمبر بھی درج تھا۔ مگر کئی مہینے تک جب وہ لوگ پاکستان سے اس نمبر پر فون کرتے تو کوئی فون اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ مایوس ہو کر سب نے فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اس نے اس سلسلے میں بھی زبیر احمد سے مدد مانگی۔ انہوں نے نہایت خوش دلی سے اس کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا اور خود اپنے طور پر بھی مطلوبہ ایڈریس تک رسائی حاصل کی۔ لیکن ان کے مطابق وہاں کوئی اور لوگ آباد تھے۔ نو دس سال پہلے صمد چچا اور ان کی فیملی ہنسلو شفٹ ہو گئے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے پاس صمد چچا کا کوئی ایڈریس یا فون نمبر نہ تھا۔ وہ حد درجہ مایوس ہو گیا۔ وہ خود صمد چچا کا حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے ایک پاکستانی لڑکے کو جب اس کی پریشانی کا علم ہوا تو اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ بھی ہنسلو میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اس کے تایا زاد بھائی عرفان اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ ان کے سسر جو عرصہ دراز سے لندن میں مقیم ہیں اور یہیں ساؤتھ ہال میں ریڈ لائن ہوٹل میں بطور منیجر کام کرتے ہیں وہ بہت سے پاکستانی خاندانوں میں شناسائی رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم کرتے ہیں شاید وہ تمہارے چچا کو جانتے ہوں۔

اس لڑکے کی اس بات پر فاز کو ڈھارس ہوئی اور وہ اس لڑکے کے ساتھ ریڈ لائین ہوٹل چلا گیا۔ جہاں اس کے تایا زاد عرفان کے سسر اکرام اللہ صاحب نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور فاز سے بھی وعدہ کیا کہ وہ جلد اپنے جاننے والوں سے صمد انصاری کے بارے میں معلوم کریں گے۔ اسے لندن آئے ہوئے سال ہونے کو آ گیا۔ مگر تمام تر کوششوں کے باوجود وہ صمد چچا تک نہیں پہنچ سکا۔

"فاز یار یہاں "گرین پب" کے نام سے ایک کلب ہے۔ جہاں عموماً پاکستانی گلوکار وغیرہ آکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہاں پاکستانی فنکار آتے ہیں لہٰذا انہیں سننے یقیناً یہاں مقیم پاکستانی بھی آتے ہوں گے۔ ہم ایسا کرتے ہیں وہاں کے آرگنائزر سے جا کر بات کرتے ہیں شاید وہ تمہارے چچا سے واقف ہوں۔" اس دن جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اس کا پاکستانی دوست سعید اسے مشورہ دینے لگا۔ وہ بھی فاز

کے ساتھ اس کے چچا کو ڈھونڈنے میں بڑی مدد کر رہا تھا۔ صمد چچا کو ڈھونڈنے کی تگ و دو میں وہ بے حد مصروف تھے بالآخر۔ پھر ایک سال تین مہینے کے بعد وہ ایک صاحب کے ذریعے صمد چچا تک "ھنسلو" جا پہنچا۔

☼ ☼ ☼

"اس مرتبہ فاز جو رقم بھیجے گا اس میں سے گھر کی مرمت کرواؤں گی۔" صفیہ نے مٹر چھیلتے ہوئے دیوار کے ادھڑے ہوئے پلستر کو دیکھ کر کہا۔

"جی امی میں آپ سے یہی کہنے والی تھی۔ اللہ کا شکر ہے فاز بھائی نے اتنی رقم بھیج دی ہے کہ ہم اپنے گھر کی حالت درست کرا سکیں۔ کوئی آتا ہے تو کتنی شرم آتی ہے۔ نہ ڈھنگ کا فرنیچر ہے اور نہ ہی کارپٹ وغیرہ کچھ ہے۔ کچھ نہیں تو ایک عدد کارپٹ ہی ڈرائنگ روم میں ڈلوا دیں۔" ثانیہ منہ میں مٹر کا دانہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"نہیں گھر کی مرمت کروانا تو چلو ضروری ہے۔ باقی سب کام میں فاز کے آنے کے بعد ہی کروں گی۔ پہلے ارم کے لیے کچھ جمع کر لوں۔ ویسے بھی بیٹا اتنی محنت سے وہ پیسہ ہمیں بھیج رہا ہے۔ اگر سب کچھ ختم کر کے بیٹھ جاؤں گی تو اس کے بھی دل میں خیال آ سکتا ہے کہ میری ماں نے سارا پیسہ اڑا دیا۔ وہ آ جائے اور اپنی مرضی سے جیسا چاہے خرچ کرے۔" صفیہ نے ثانیہ کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔ ثانیہ محض سرہلا کر رہ گئی حالانکہ اسے ماں کی بات سے قطعی اتفاق نہ تھا۔

"ارے دلہن۔ فاز کا فون آئے تو پوچھنا صمد کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔" دور بیٹھی صفیہ کی ساس نے صفیہ سے کہا۔ ان کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ جب بھی صمد کا ذکر کرتیں یوں ہی گلوگیر ہو جایا کرتی تھیں۔ آخر کو صمد ان کی اولاد تھا۔ جسے پچھلے بیس سال سے دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترس رہی تھیں۔ کبھی کبھی انہیں لگتا کہ شاید ان کی سانس کی ڈوری صمد کے آنے کی آہٹ سے بندھی ہے۔ جس دن وہ آ جائے گا وہ بھی اپنا سفر تمام کریں گی۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے سفید ململ کے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔

"مت رویا کریں اماں۔ میرا دل کہتا ہے صمد ضرور ملے گا۔ وہ ٹھیک ہو گا دیکھ لینا۔ بس اپنے حال میں مست ہو گیا ہے۔" صفیہ ساس کا دکھ سمجھتی تھیں۔ وہ اکثر انہیں اسی طرح کے الفاظ سے تسلی دیتی رہتیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر تک اس کو سینے سے لگائے سسکتے رہے۔ فاز بھی یوں ان کے سینے سے لگا ہوا تھا جیسے اگر وہ الگ ہوا تو صمد چچا اک مرتبہ پھر کہیں کھو جائیں گے۔

صمد چچا اور اس کے ابو میں بے حد مشابہت تھی۔ حتی کہ آوازیں بھی ایک جیسی لگتیں۔ اس وقت صمد چچا کو دیکھ کر اسے اپنے ابو یاد آ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ شاید وہ بھی ان کے سینے سے لگا اپنی محرومی کی پیاس بجھا رہا تھا۔

صمد چچا کی حالت دیکھ کر وہ بھی بہت دلگرفتہ ہوا۔ وہ بہت کمزور لگ رہے تھے دوسرے تنہائی کے اسیر اور تیسرے معذوری۔

"یہ سب کیسے ہوا صمد چچا۔"

"بس بیٹا۔ کچھ باتیں نصیب میں لکھی ہوتی ہیں اور کچھ انسان اپنے اعمال سے اپنے مقدر کی کتاب میں لکھوا لیتا ہے اور بعد میں خود ہی خدا سے شکوہ کرنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ معذوری تو میرے نصیب میں لکھی تھی۔ لیکن یہ تنہائی میری اپنی پیدا کردہ ہے۔"

"لیکن صمد چچا۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ کیا وہ بھی اپنے ماں کے ساتھ چلی گئی۔" وہ جلد از جلد صمد چچا کی کہانی سننا چاہتا تھا۔

"نہیں بیٹا اس نے تو اپنی ماں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی۔ لیکن اس نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔"

"پھر۔؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"میں نے اس کے لیے گورنس رکھ لی تھی۔ وہ ایک مسلمان عورت تھی۔ بیوہ تھی یہاں بیٹے کے پاس رہتی تھی۔ لیکن بیٹے اور بہو کے خراب رویے سے دلبرداشتہ ہو کر ہمارے برابر والے پڑوسی جو اس کے دور کے رشتے دار تھے وہاں آکر رہنے لگی تھی۔ جس وقت ورشا کی ماں صالحہ مجھے چھوڑ کر گئی میں بہت بکھر گیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ مزاجاً" ایک فرنگن عورت کی طرح تھی۔ اسے گھربار سے متعلق کسی بھی شے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بارہ سال بھی اس نے جس طرح میرے ساتھ گزارے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اسے اپنے حسن اور اپنی دولت پر بڑا ناز تھا۔ وہ ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ میں اسے کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آزادانہ مردوں سے میل جول رکھتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی بھی اس رنگ میں رنگے۔ لہٰذا میں نے اپنے پڑوسی مختار صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور یوں سلطانہ گورنس کے طور پر میرے گھر آگئی اور ورشا مکمل طور پر اس کی دسترس میں چلی گئی۔ اس نے ورشا کی بڑی اچھی تربیت کی۔ میں بالکل بے فکر ہو گیا تھا اور ایک دن صالحہ جب اپنے کسی دوست مرد کے ساتھ ڈنر پر جا رہی تھی میں نے اسے روکنا چاہا۔ بس پھر..." شاید صمد چچا بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

"وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی پھر اسے گئے ہوئے چھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ میں چونکہ بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے سلطانہ سے نکاح کی درخواست کی۔ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں دو چار سال بڑی ہو گی لیکن میں صرف اپنی اور اپنی بیٹی کی بھلائی دیکھ رہا تھا۔ یہاں اس ماحول میں ورشا کو ایک نگہبان کی اشد ضرورت تھی۔ جو صرف اور صرف ماں کے روپ میں ہی ہو سکتی تھی۔

جب ورشا کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئی۔ اصل میں... میں اس کو سمجھ نہیں سکا۔ وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی کوئی دوست نہیں بنائی۔ وہ اسکول میں بھی تنہا رہتی تھی۔ وہ ماں کی کمی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اس نے آناً" فاناً" سلطانہ کو نکال باہر کیا اور پھر... وہ بگڑتی چلی گئی۔ وہ دیر تک گھر سے باہر رہنے لگی۔ میں جس بات سے اسے روکتا۔ وہ وہی کام کرتی۔ میری ہر بات کو رد کر کے اسے گویا خوشی محسوس ہوتی۔ اسی طرح ایک سال اور بیت گیا اور پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

"پاپا میں شادی کر رہی ہوں۔" یہ خبر میرے لیے دھماکہ تھی۔ میں سرتاپا لرز گیا۔

"کس سے؟"

"اپنے ایک پاکستانی دوست سے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے کمال ضبط سے اس کی بات سنی۔ "بیٹا مجھے اپنے اس دوست سے لا کر ملاؤ۔"

پھر جب میں اسے لڑکے سے ملا تو نہ جانے کیوں وہ مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ دوسرے وہ بالکل تنہا یہاں رہتا تھا اس کی ساری فیملی پاکستان میں تھی۔ میں نے ورشا سے کہا کہ وہ اس سے شادی نہ کرے۔ وہ ٹھیک لڑکا نہیں ہے۔ جس پر ورشا نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

اور پھر ایک دن وہ خاموشی سے یہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ کسی نے بتایا وہ گلاسکو چلی گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ شادی کر کے ایڈمبرا چلی گئی ہے۔ کوئی کہتا وہ یہیں اپنے کسی دوست کے ساتھ ... رہ رہی ہے۔" صمد چچا کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"اسی کو تلاش کرنے کے چکر میں ایک دن میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ یوں اس کی تلاش بھی ختم ہوئی۔" فاز نے دیکھا صمد چچا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ مجھے آج تک نہیں ملی۔ نہ وہ لوٹی اور نہ کوئی رابطہ کیا۔" صمد چچا باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہے تھے۔

"لیکن چچا آپ نے ہم سب سے ناطہ کیوں توڑا؟"

یہ سوال اب تک فاز کے ذہن میں مچل رہا تھا۔ بالآخر زبان پر آگیا۔

"بس بیٹا...... !صمد چچا نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "صالحہ سے شادی کرنے کے بعد میرے سارے جذبے' ساری محبتیں اسی کے لیے وقف ہو گئی تھیں اور پھر سال بھر بعد ورشا آگئی اس کے بعد تو مجھے کوئی یاد ہی نہ رہا۔ میں اپنی دنیا میں مگن ہو گیا تھا۔ پہلے پہل تو میں اماں کے نام خط وغیرہ بھی بھیج دیا کرتا تھا۔ پھر میرے رات و دن بھی اتنے مصروف گزرنے لگے کہ میں آہستہ آہستہ اس فارمیلٹی کے قابل بھی نہ رہا۔ ہوش آیا بھی تو تب جب میری اپنی خوشیاں مجھ سے منہ موڑ چکی تھیں۔ پہلے خوشیوں نے رستہ نہ دیا اور پھر غموں نے سب سے غافل کر دیا۔ ایک آدھ بار خیال آیا بھی تو شرمندگی کے مارے ہمت نہ کر سکا۔ یقین کرو بیٹا تنہائی میں جب کبھی تم سب اور خاص طور پر اماں کی یاد آئی تو محبت کی یہ چنگاریاں پل بھر میں شعلہ بن کر میرے پورے وجود کو جھلسا دیتی تھیں۔ میں روز جیتا تھا اور روز مرتا تھا۔ کس منہ سے سب کو اپنی روداد سناتا۔ یہی سوچ کر کنارہ کر لیا کہ پہلے کون سا سب کو شانت کیا ہے جو اب سب سے ہمدردی کی توقع رکھوں۔ میں اپنے دکھ اکیلے جھیلنا چاہتا تھا اور جھیل بھی رہا تھا۔ میں نے اپنوں کو چھوڑا تھا نا اسی لیے صالحہ اور ورشا بھی مجھے چھوڑ گئیں۔" ان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند جو تند و تیز ہواؤں کے رحم و کرم پر ہو۔

"آپ نے صرف اپنے آپ پر ہی نہیں ہم سب پر ظلم کیا ہے صمد چچا آپ کو ہمارے اوپر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ کیا ہم رشتوں کی اتنی نازک ڈور میں بندھے تھے کہ ہلکی سی رنجش یا معمولی سی کوئی خلش اس رشتے کی ڈور کو یوں بے دردی سے توڑ دیتی۔

نہیں صمد چچا۔ یہ صرف آپ کی خود ساختہ سوچ تھی۔ جس نے ایک ماں سے اس کا بیٹا چھین لیا۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی بوڑھی ماں کا خیال نہ آیا جو آپ کے انتظار میں سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہے صرف سانس ہے۔ جو شاید آپ کے آنے کی منتظر ہے۔ بہت یاد کرتی ہیں دادی آپ کو اور اب میں آپ کو لے کر جاؤں گا میں نے دادی سے وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کو ساتھ لے کر پاکستان آؤں گا میں آج ہی آپ کے ملنے کی اطلاع انہیں دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے نا؟" فاز نے صمد کے دونوں ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"ایک ادھورا انسان وہاں جا کر کیا کرے گا۔ انہیں کہہ دو کہ صمد انصاری مر گیا۔ قرار آجائے گا میری ماں کو۔ کہہ دو کہ ختم کرے اپنا انتظار۔ مر گیا صمد مر گیا۔" صمد چچا اس کے ہاتھوں پر سر رکھ کر تڑپ تڑپ کر رو دیے۔

"میں سب کو کیسے بتاؤں گا کہ میری بیٹی چلی گئی مجھے چھوڑ کر۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے۔ فاز نہیں ہے مجھ میں اتنی ہمت۔"

اس وقت فاز کا دل اس ان دیکھی لڑکی کے لیے نفرت سے بھر گیا۔ جس نے جیتے جی اپنے باپ کو مار دیا تھا۔ "ہوں بد کردار ماں کی بد کردار بیٹی"۔ اس نے نفرت سے سر جھٹک دیا۔

☼ ☼ ☼

"آئے ہائے میرا دل کوئی مسل رہا ہے۔ میرا بچہ کیسے اکیلے اتنے دکھ جھیل رہا ہے۔ مالک اتنے دنوں میں خبر بھی ملی تو کس طرح۔ ہائے میرے اللہ میں کیا کروں کیسے اسے اپنے سینے سے لگا کر دلاسا دوں.....؟" ان کے بوڑھے لرزتے وجود کی ایک ایک شکن سراپا گریہ تھی۔

"چپ ہو جائیں اماں۔ مت ہلکان کریں اپنے آپ کو۔ سزا ملی ہے اسے اپنوں سے دور رہنے کی اتنا سنگ دل انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا جو ماں تک کو یاد نہ رکھ سکا۔ دولت کی ایسی بھی کیا مستی کہ انسان خون سے بھی مکر جائے۔ مگر دیکھ لیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس نے ماں کو تڑپایا آج خود اپنی اولاد کے لیے تڑپ رہا ہے۔ جانے کس خاندان میں

شادی رچائی تھی جو اتنا گندہ خون نکلا۔" صفیہ نے ساس کی آہ و زاری دیکھ کر اچھا خاصا لیکچر دے دیا۔

"نہ دلہن ایسے نہ بول۔ میں نے اسے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔" انہوں نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر گڑگڑا کر کہا۔ "بس اب اس کی مشکل ختم ہو جائے۔ میرے بیٹے کو قرار آجائے۔ اس کی خوشی کی خبر مل جاتی تو میں یوں نہ تڑپتی۔" بوڑھے وجود پر لرزہ سا طاری تھا۔

"بس کریں اماں چپ ہو جائیں اللہ بہتر کرے گا۔" صفیہ نے ایک دم ساس کو گلے لگاتے ہوئے تسلی دی۔

"اب انشاءاللہ میرا فاز لے کر آئے گا صمد کو۔ آپ دل چھوٹا مت کریں۔" صفیہ کو ایک دم اس ناتواں وجود پر ترس آگیا جو بیٹے کی جدائی میں کبھی اتنا تڑپ کر نہیں روئیں جیسے اب اس کی پریشانیوں اور معذوری کی خبر پر تڑپ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور اب وہ واپس آگئی تھی۔ وہ ایک دم خیالوں کی دنیا سے واپس آگیا۔ ورشا کا خیال آتے ہی اس کے حلق تک تلخی بھر گئی۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ جب سے ورشا واپس آئی ہے صمد چچا کافی بہتر نظر آنے لگے تھے اور وہ بھی پوری تندہی سے باپ کی خدمت گزاری میں لگی رہتی۔ فاز نے محسوس کیا کہ ورشا یا تو صمد چچا کے کاموں میں لگی رہتی ہے یا پھر کسی کونے میں بیٹھی خاموش خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ فاز سے کسی قسم کی کوئی بات کرنے کی اس نے قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ صمد چچا اکثر اسے کہتے رہتے کہ ورشا بات کیا کرو۔ بولا کرو فاز کے ساتھ بات کر لیا کرو۔ مگر وہ ہوں۔ ہاں کر کے وہاں سے اٹھ جاتی۔ اور فاز تو اس سے بات کرنا درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہا تھا۔ اور اب تو وہ پوری سنجیدگی سے یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"لیکن بیٹا۔ یہ گھر اتنا بڑا ہے کہ تین نفوس اس میں باآسانی سما سکتے ہیں۔ پھر تم یہاں سے کیوں جا رہے ہو۔" صمد چچا اس کے جانے کا سن کر خاصے آزردہ دکھائی دے رہے تھے۔

"دراصل چچا میں نے ایک جگہ ملازمت کی بات کی تھی۔ دیکھیں نا اب آپ کے پاس ورشا آگئی ہے۔ یقیناً" وہ یہ سب ذمہ داریاں اٹھا سکتی ہے۔ جہاں مجھے ملازمت ملی ہے وہیں قریب میں گھر بھی ہے جو پے انگ گیسٹ کے لیے خالی ہے۔ میں نے سوچا اتنی دور آنے جانے کے جھنجھٹ سے بچ جاؤں گا۔ لیکن آپ بے فکر رہیں میں یہاں آتا رہوں گا اور آپ کو جو کوئی بھی کام ہو مجھ سے بلا تکلف کہہ دینا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسی تمہاری مرضی۔" صمد چچا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ جانتے تھے کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے اور وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اس کی وجہ بھی انہیں پتہ چل گئی تھی۔ وہ اس بات پر دلگیر تھے کہ فازان کی بیٹی کے وجود سے گریزاں ہے۔ یہ بات انہیں بے حد تکلیف دے رہی تھی۔

مگر وہ بھی کیا کرتے۔ ورشا ان کی اولاد تھی۔ بہت محبت تھی انہیں ورشا سے۔ وہ اسے معاف کر چکے تھے اور پھر جس طرح بکھرے وجود کے ساتھ وہ لوٹ کر آئی تھی اس بات نے تو انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن آج بھی ان کے دل میں ورشا کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ مگر وہ بدل گئی تھی۔ اس نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھنٹوں غائب دماغی سے بیٹھی رہتی۔ اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جتنی دیر ان کے پاس ہوتی خاموشی سے صمد کی گود میں سر رکھے لیٹی رہتی۔

وہ تو سوچ رہے تھے وہ فاز سے درخواست کریں گے کہ میری بیٹی کو زندگی کی طرف واپس لاؤ۔ اسے ہنسنا سکھاؤ۔ اس کے ساتھ ہمدردی کرو۔ مگر انہیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ماں باپ جتنا وسعت والا دل ہر کسی کا نہیں ہوتا۔

صرف ماں باپ، ہی اولاد کی غلطیوں کو معاف کر کے انہیں گلے سے لگا لیتے ہیں۔ مگر یہ دنیا کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ یہ تو قدموں تلے روند دیتی ہے۔ صرف ایک انسان کو ہی نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کو سولی چڑھا دیتی ہے اور ایک بار نہیں پل پل مارتی ہے۔ اپنی زبان سے "نگاہوں کے تیر سے۔ صرف وہی عدالت ہے جو اوپر والا چلا رہا ہے، جو معاف کر دیتا ہے ہر گناہ گار کو ہر بار توبہ کرنے پر۔ مگر یہ دنیا کی عدالتیں معاف نہیں کرتیں۔ صمد نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ وہیل چیئر کے ہینڈل پر ٹکا دیا۔

"انیسہ باجی آج فاز کا فون آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ صمد کی بیٹی گھر واپس آ گئی ہے بتاؤ کیسا باپ ہے۔ ایسی لڑکی کو دوبارہ گھر میں رکھ لیا۔" صفیہ نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر انیسہ بیگم کو بتایا۔ جن کے پان لگاتے ہاتھوں کو بریک لگ گیا۔

"ہائیں... واپس آ گئی۔ ہائے کمبخت کہاں منہ کالا کر کے آئی ہے یہ بتایا تھا فاز نے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پان کا ٹکڑا پاندان میں پٹخ دیا۔

"نہیں یہ نہیں بتایا۔ وہ تو خود اس قدر نفرت کر رہا ہے کہہ رہا تھا کہ اس کو دیکھ کر دل چاہ رہا ہے گردن کاٹ دوں۔" میں نے کہا... تجھے کیا پڑی ہے اپنے ہاتھ گندے کرنے کی۔ گردن کاٹے تو باپ کاٹے۔ جب باپ کو ہی غیرت نہیں ہے تو تو کون اور میں کون؟ اور ویسے بھی وہاں کی عورتیں تو یوں ہی ایک مرد چھوڑتی اور دوسرا پکڑتی ہیں۔ آج آ گئی کل پھر کسی کے ساتھ چلی جائے گی۔" صفیہ نے نند کو فاز کی باتوں سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

☼ ☼ ☼ ☼

وہ اپنا تمام ضروری سامان سمیٹ کر صمد چچا کے پاس آ گیا۔ جو خلاؤں میں جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے آہٹ پر فاز کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا بیگ دیکھ کر وہ ایک دم اداس ہو گئے۔

"جا رہے ہو بیٹا۔" انہوں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں ہر اتوار کو آپ کے پاس آؤں گا۔" وہ دونوں گھٹنے ٹیک کر نیچے بیٹھ گیا۔

"بیٹا جانے سے پہلے تم سے اک بات کرنا تھی۔"

"جی صمد چچا بولیں۔" وہ سنبھل کر وہیں بیٹھ گیا۔

"فاز... میری بیٹی اتنی بری نہیں ہے۔ وہ معصوم ہے۔ کم عمر ہے۔ اس سے جو غلطی ہوئی ہے اسے بھول جاؤ۔ اس نے جو کچھ کیا ذہنی دباؤ میں آ کر کیا۔ غلطی میری تھی جو اس کی پرابلم کو سمجھ نہ سکا۔ وہ تنہائی کا شکار ہو گئی تھی اور ایسے میں میرے شادی والے فیصلے پر وہ سمجھی کہ شاید میں بھی اس کی ماں کی طرح اس سے دور ہو جاؤں گا سو اس نے یہ سب رد عمل کے طور پر کیا۔ اسے معاف کر دو۔" صمد چچا نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"اسے اس ڈپریشن سے نکال دو۔ وہ بہت ٹوٹ گئی ہے تم اسے سنبھال سکتے ہو۔ پلیز بیٹا میرا یقین کرو میری بیٹی بہت اچھی ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں موجود بے یقینی کی تحریر پڑھ چکے تھے۔

"نہیں صمد چچا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یقیناً آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں کون ہوتا ہوں کسی کو برا سمجھنے والا۔" اس نے جھوٹ کو انکساری کے غلاف میں لپیٹ کر جواب دیا۔

"میں چاہتا ہوں۔ میری بیٹی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ اسے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے کسی بکھرے وجود کو سمیٹنا بھی تو عبادت ہے نا۔" اس نے تائیدی انداز میں محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"فاز بیٹا... کیا... کیا میں تم سے اس کی توقع رکھوں۔" وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"جی... میں...؟" فاز گڑبڑا سا گیا۔

"آپ کو تو پتہ ہے صمد چچا کہ میں اور ورشا زندگی میں پہلی مرتبہ متعارف ہوئے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ... وہ تو مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ پھر بھلا میں یہ سب کیسے کر سکتا ہوں۔" صاف انکار کرنا اس کے

بس میں نہیں تھا۔ یہاں آنے کے بعد جس طرح صمد چچا نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اس پر اعتبار کیا تھا اس صورت حال میں وہ اتنی بے مروتی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس کا اجتناب صمد چچا سمجھ چکے تھے۔ تبھی ایک زخمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ مایوسی سے سر جھکا کر رہ گئے۔

وہ بھی کیا کرتا وہ مجبور تھا نہ جانے کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر وہ کوفت کا شکار ہونے لگتا تھا۔ اس کا دل کرتا کہ وہ اس کے سامنے ہی نہ آئے۔ شاید یہ نفرت ہی کی کوئی قسم تھی جو بڑے بے ضرر انداز میں اپنا اظہار کر رہی تھی۔

فاز صمد چچا کے گھر سے آ تو گیا تھا۔ مگر ان کا پژمردہ اور مایوس چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ ان کا اپنا خون تھا۔ دوسرے اس کے والد کی اتنی شباہت تھی صمد چچا سے کہ کبھی کبھی لگتا کہ اس کے ابو راہ عدم سے لوٹ آئے ہوں۔ فاز کا مقصد انہیں دکھ دینا نہیں تھا۔ مگر جس بات کی خواہش صمد چچا کر رہے تھے وہ تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو دو ماہ کسی غیر لڑکے کے ساتھ گزار کر لٹ پٹ کر واپس آگئی ہو ایسی لڑکی کے ساتھ وہ ہمدردی تو در کنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ صمد چچا کی خواہش۔

اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے خاندان پہ یوں بدنامی کا داغ لگے گا۔ فاز نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس لڑکی کو جان سے مار دیتا۔ شکل دیکھو تو لگتا ہے سارے جہاں کی معصومیت اسی کے پاس ہے اور کرتوت دیکھو۔ کیا تھا جو تم ایسی نہ ہوتیں۔ یہ سب نہ کرتیں؟

اس کے دل نے آنکھوں میں ابھرنے والی ورشا کی شبیہہ سے کہا۔ فاز نے گھبرا کر دل کو گھر کا۔ اف یہ میں کس طرف جا رہا ہوں خدا نہ کرے جو میں اس کے بارے میں سوچوں۔" فاز نے نفرت سے سر جھٹک دیا اور ازراہ دور اندیشی رابعہ کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا صفیہ فاز نے کوئی فون وغیرہ کیا۔" انیسہ بیگم نے آتے ہی چادر سائیڈ پر رکھ کر پوچھا اور ماں کا پاندان آگے کھسکا کر بیٹھ گئیں۔

"جی ابھی دو دن پہلے ہی فون کیا تھا فاز نے بتا رہا تھا کہ وہ صمد کے گھر سے کہیں اور شفٹ ہو گیا ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" انیسہ بیگم نے فوراً ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"اصل میں میں تم سے یہی بات کرنے آئی تھی کہ فاز کا فون آئے تو کہہ دینا کہ اب وہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بڑے ہنر ہوتے ہیں ایسی لڑکیوں میں۔ کہیں اپنی ماں کی طرح نہ اڑا لے میرے بھتیجے کو۔"

"ارے نہیں باجی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ بڑا غیرت مند ہے وہ۔ دیکھ لیں میں نے تو کچھ کہا بھی نہیں اور وہ خود ہی دوسری جگہ چلا گیا۔" صفیہ نے بڑے ناز سے نند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انیسہ بیگم کے چہرے پر تنا اندیشوں کا جال کچھ ڈھیلا ہوا۔

"میں تو کہتی ہوں فاز سے کہو بس واپس آجائے۔ ڈیڑھ سال بھی بہت ہوتے ہیں۔" شاید ابھی کچھ اندیشے باقی تھے۔

"ہوں سوچ تو میں بھی یہی رہی تھی۔" صفیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔

کارڈنگ ٹن اسکوائر کے مقابلے میں یہ علاقہ تھوڑا پسماندہ تھا۔ شروع میں تو اس کا یہاں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ کہاں وہ ہرا بھرا صاف ستھرا علاقہ۔ صبح صبح جب وہ چہل قدمی کے لیے نکلتا تو آس پڑوس کی عورتیں اپنے اپنے کتوں کو لیے چہل قدمی کرتی ملتیں۔ وہ سب سے ہیلو ہائے کرتا ہوا آگے نکل جاتا۔

اس ایک کمرے کے فلیٹ میں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا تھا۔ جس میں **اٹیچڈ** باتھ اور کچن کی سہولت موجود تھی۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ وہ کسلمندی سے بیڈ پر آڑا ترچھا پڑا اینٹھ رہا تھا۔ پورے ہفتے شدید محنت کے بعد چھٹی کا دن کسی عید سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں وہ ایک اسٹور میں بطور ہیلپر کام کر رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے شام سات بجے تک مسلسل کام کرنا یقیناً" بڑا محنت طلب کام تھا۔ اسٹور کی اشیاء کی دیکھ بھال صفائی ستھرائی سب اس کے ذمے تھی۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا ہر اتوار کو صمد چچا کی طرف ضرور جاتا اور اپنے طور پر کوشش کر کے ان کے سارے کام نمٹا دیتا تھا۔

آج بھی وہ وہیں جانے کا سوچ رہا تھا مگر سستی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے اٹھا اور تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

کارڈنگ ٹن اسکوائر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ یہاں رہنے کی وجہ سے صمد چچا کے گھر کا نمبر اسے اچھی طرح یاد ہو گیا تھا۔ ورنہ یہاں کے ایک جیسے گھر کسی بھول بھلیوں سے کم نہیں تھے۔

وہ لکڑی کا پھاٹک کھول کر اندر آ گیا۔ اندرونی دروازہ اندر سے لاک تھا۔ کال بیل بجانے پر دروازہ کھلا وہ خاموشی سے اندر آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولنے والی شخصیت کو دیکھنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ صمد چچا تو دروازہ کھول نہیں سکتے۔

لونگ روم میں صمد چچا وہیل چیئر پر بیٹھے دونوں ہاتھ گود میں رکھے جانے کن سوچوں میں گم تھے کہ اس کے وجود سے بے خبر ہی رہے۔ برسوں کی تھکن ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ انہیں دیکھ کر اس دیمک زدہ دروازے کا گمان ہو رہا تھا جو ہلکے سے دباؤ سے زمین پر گرنے کو تیار ہو۔ اس کا دل آزردہ ہو گیا۔

"السلام علیکم چچا....."

انہوں نے ایک خالی نگاہ اس پر ڈالی اور ہلکے سے ہونٹوں کی جنبش سے سلام کا جواب دے کر اسی انداز میں بیٹھے رہے۔

"کیسے ہیں چچا؟" فاز نے قریب پڑے ہوئے کشن پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس بات پر جس طرح صمد چچا نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اسے لگا جیسے وہ کسی دھاگے سے بنے ہوئے پل پر کھڑے ہوں جہاں لبوں کی ہلکی سی جنبش انہیں گہرے پاتال میں گرا دے گی اور پھر انہوں نے ہولے ہولے اپنے لرزتے ہاتھ اٹھائے اور اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"کیا بات ہے صمد چچا۔" وہ سچ مچ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میری بیٹی کو بچا لو وہ مر جائے گی..... وہ بہت ڈیریس ہے وہ کچھ کر لے گی۔ کل..... کل اگر میں نہ دیکھ لیتا تو وہ سلیپنگ پلز کھا کر سو جاتی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو دیے۔

"کیا.....؟" فاز نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بیٹا..... کل جب اس نے مجھے روتے دیکھا تو وہ میرے پاس آ گئی اور کہنے لگی کہ پاپا مجھے پتہ ہے آپ میری وجہ سے دکھی ہیں۔ کیونکہ آپ کا بھتیجا بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ بلکہ وہ کیا اس کے سارے گھر والے مجھ سے نفرت کر رہے ہوں گے۔ کاش پاپا میں لوٹ کر نہ آتی وہیں کہیں مر کھپ جاتی کاش..... کاش آپ کو میری وجہ سے اتنی ذلت نہ اٹھانی پڑتی لیکن..... آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اب آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف گئی۔ مجھے کسی انہونی کا احساس ہوا میں بھی جلدی جلدی وہیل چیئر چلاتا اس کے پیچھے گیا تو دیکھا کہ وہ بہت سی گولیاں ایک ساتھ کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اس سے دور تھا اس لیے روک نہیں سکتا تھا' اس لیے میں نے صرف اس کو روکنے کے لیے ایک زوردار چیخ ماری اور آنکھیں بند کر لیں کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ میری طرف ضرور دوڑے گی۔ بس جب وہ میرے پاس آئی تو بڑی مشکل سے میں نے رو رو کر اسے روکا اس حرام موت سے۔ ورنہ میں بھی آج تمہیں زندہ نظر نہیں آتا۔ میری بچی کو بچا لو فاز۔" وہ بری طرح گڑگڑا رہے تھے۔ فاز کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"صرف تم ہی اسے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتے ہو۔ وہ بہت تنہا ہو گئی ہے، بہت ٹوٹ گئی ہے۔ اسے مزید نہ

تو تُو بیٹا اسے بچا لو۔" صمد چچا بری طرح تڑپ رہے تھے۔ "میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ بس اتنی التجا ہے اسے پاکستان لے جانا۔ لیکن پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری بیٹی کو سہارا دو گے۔ میری خاطر اپنے چچا کی خاطر۔"

وہ بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بات صمد چچا پر کیسے واضح کرے۔ کیسے بتائے کہ وہاں کسی کو انتظار کی راہوں پر تنہا چھوڑ کر آیا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کے اعتماد کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے عہد کو نبھانا چاہتا ہے۔ جو اس نے انیسہ پھپھو سے کیے۔ امی سے کیے۔

"صمد چچا۔ آپ گھبرائیں نہیں کچھ نہیں ہو گا میں ورشا کو سمجھاؤں گا۔" وہ انہیں تسلیاں دے کر ورشا کے پاس چلا آیا جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ غالباً وہ کچھ دیر پہلے روئی تھی تبھی اس کی پلکیں گیلی ہو کر ایک دوسرے سے چپکی ہوئی تھیں۔ فاز نے کمرے میں پہنچ کر زور سے دروازہ بند کیا ورشا نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی فاز نے الٹا اس سے انوکھا سوال کر ڈالا۔ وہ بھلا اپنے آپ کو کیا سمجھے گی جو اپنے وجود سے ہی انکاری ہو۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ تاہم وہ ابھی تک خاموش ہی کھڑی تھی۔

"کیا چاہتی ہو تم بولو؟" ایک اور حیران کن سوال۔

وہ کسی سے کیا چاہے گی جس کی دسترس سے سکون جیسی قیمتی شے بھی دور ہو گئی ہو۔ ایک مبہم سی استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر دور ہو گئی۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری ہو گیا یوں گویا کسی نے زندگی کی تختی پہ کوئی تحریر لکھ کر مٹا ڈالی ہو اور آہستگی سے چلتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

"روز روز مارنے سے بہتر ہے اپنے باپ کو ایک مرتبہ ہی مار دو۔ کیوں سولی پر لٹکا رکھا ہے تم نے انہیں؟"

"جو خود پچھتاوے کی صلیب پر لٹکا ہو وہ بھلا کسی کو کیسے سولی چڑھا سکتا ہے۔ مرے ہوئے انسان بھی کبھی کسی کو مارا کرتے ہیں۔" ورشا کی آنکھوں کی بستی زیر آب آ گئی وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔

"دیکھو ورشا بی بی تمہیں اتنی غیرت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی جس جگہ تم رہ رہی ہو وہاں تو اس طرح کی حرکتیں بہت عام ہیں۔ تم جیسی نہ جانے کتنی یورپین لڑکیاں یوں ہی گھروں سے نکل کر اپنے بوائے فرینڈز کے دن و رات رنگین کرنے چلی جاتی ہیں۔ پھر تمہیں کس بات پر شرمساری ہے۔ تم نے بھی تو صالحہ بیگم کی بیٹی ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اگر اتنی ہی شرم و غیرت موجود تھی تو یہ سب کرنے سے پہلے سوچا ہوتا۔"

"بات سنیں مسٹر فاز انصاری۔ میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں اور رہا میری ماں کا سوال تو میں صالحہ بیگم کی کوکھ سے پیدا ضرور ہوئی ہوں لیکن میری رگوں میں دوڑنے والا لہو انصاری فیملی کا ہے اس لیے آپ مجھے...."

"شٹ اپ...." فاز سے اپنے خاندان کی تذلیل برداشت نہ ہو سکی۔ "میں تمہارے اور اپنے درمیان موجود اس رشتے کو اپنے لیے گالی سمجھتا ہوں سمجھیں تم۔"

"جی ہاں بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ بہت آسان ہے کسی پر فرد جرم عائد کر دینا کیونکہ کسی بھی انسان کو نظروں سے گرانے کے لیے چند غلیظ لفظوں کی ہی ضرورت تو ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو آپ جیسے لوگ اپنی زبان کو بھی زحمت نہیں دیتے بلکہ اپنی منفی سوچ سطحی سی ذہنیت اور نظروں کے بارے سے ہی مقابل کو چت کر دیتے ہیں۔ یہ بھی آپ ہی جیسے لوگوں کا طرہ ہے۔"

"گرے ہوئے کو گرانے کی ضرورت نہیں پڑتی مس ورشا۔ جو پہلے ہی سطح سے لگا ہوا ہو اس کے لیے اپنی زبان یا نگاہ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی

اور تمہارا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔" اپنا حساب چکانے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

"صمد چچا۔۔۔ کیا ہوا آپ کو۔" وہ گھبرا کر ان کی طرف دوڑا۔ وہ شاید وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش میں نیچے گر گئے تھے۔

ان کے ماتھے اور ہتھیلیوں پر ٹھنڈے پسینے کی نمی تھی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے صمد چچا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" فاز کو احساس ہوا کہ وہ یوں ہی نیچے نہیں گرے بلکہ شاید انہیں۔۔۔ مگر سوچ کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا۔ صمد چچا اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھے لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ فاز کو فوراً" صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوا اور وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر انہیں لے کر ہاسپٹل جا پہنچا۔

انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ ہارٹ اٹیک خاصا شدید تھا۔ ڈاکٹرز نے اڑتالیس گھنٹے کا ٹائم دیا تھا۔ اگر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر ان کی ای سی جی رپورٹ درست نہ ہوئی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹرز نے صمد چچا سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن صرف ایک فرد کو ورشا فوراً" اندر ان کے پاس چلی گئی۔ وہ رات سے ہاسپٹل کی بینچ پر بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھی۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اور شب بیداری کے باعث اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ فاز کو اپنے رویے پر تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے دانستہ کبھی بھی کسی کو اپنی زبان سے رنج پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ مگر ورشا کو دیکھ کر نہ جانے کیوں وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا۔ لیکن اب اگر خدانخواستہ صمد چچا کو کچھ ہو گیا تو اس کا کیا ہو گا۔ یہ وہ حقیقت تھی جس سے انکار ممکن نہ تھا۔ اسی سوچوں کے تانے بانے بنتے وہ کاریڈور میں ٹہل رہا تھا جبھی ورشا اس کے نزدیک آ کر رکی۔

"آپ کو پاپا بلا رہے ہیں۔" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ فاز جلدی سے صمد چچا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"صمد چچا۔۔۔" اس نے آہستگی سے پکارا۔

ان کے زرد چہرے پر مایوسی، رنج اور پریشانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اسے ایک دم افسوس نے آ گھیرا۔ اس نے دیکھا صمد چچا کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ یوں جیسے ہلکی ہلکی بوندوں کے بعد برتن لبریز ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہو۔ انہوں نے اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر فاز کے ہاتھ میں دیا۔ فاز نے فرط محبت سے ان کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولا۔

"کیسی طبیعت ہے چچا۔" صمد چچا نے نفی میں گردن ہلائی۔

"آپ پریشان نہ ہوں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے انہیں دلاسا دیا۔

بعض دفعہ دلاسے بھی کسی قیامت سے کم نہیں ہوتے۔ لاکھ لہجے کو مضبوط کرو لیکن زبان کی لڑکھڑاہٹ سارے راز عیاں کر دیتی ہے۔ جیسا اس وقت اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

"ف۔۔۔ فاز میں میری۔۔۔ ب ب۔۔۔ بیٹی کا۔۔۔ خ۔۔۔ خیال رکھنا۔" الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"ہاں ہاں صمد چچا آپ بالکل پریشان نہ ہوں آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر ہم تینوں پاکستان چلیں گے۔"

"ن ن۔۔۔ نہیں۔۔۔ تت تم وعدہ۔۔۔ ک۔۔۔ کرو۔ ورشا ۔۔۔ ش۔۔۔ شش۔۔۔ شادی کر۔۔۔ ک کرو گے" انہوں نے اپنے لرزتے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"صمد چچا۔۔۔ کیا کروں" وہ حد درجہ پریشان ہو گیا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ صمد چچا کو آس دلا دے تاکہ وہ اس جانگسل صورت حال سے باہر آ سکیں۔ لیکن یہ تو دھوکا ہو گا اک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ۔ اس کے ضمیر نے آئینہ دکھایا۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ صرف ورشا سے نفرت کی بنا پر قبول کرنے سے انکاری تھا اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ جو اس نے گھر والوں

سے کیا تھا۔ وہ رابعہ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے واپس آنے کی آس دلا کر آیا تھا۔ وہ اگر ایک کو مایوسی کی دلدل سے نکالتا ہے تو دوسرے کو یاسیت کے اندھے کنویں میں دھکیلنا ہوگا۔

اس کے پاس دو راستے تھے اگر ایک راستے پر جاتا ہے تو دوسرے راستے سے ابھرنے والی سسکیاں اس کے قدم تھام رہی تھیں۔ وہ درمیان میں کھڑا تھا ایک طرف اس کا عہد رابعہ کی شکل میں تھا تو دوسری طرف صمد چچا کی التجا۔ بڑے ظرف کی بات تھی کہ وہ اس وقت اپنے لیے نہیں بلکہ دو انسانوں کے لیے پریشان تھا۔ وہ کسی کو دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ایک مرتے ہوئے انسان کو غم سے آزادی دلا کر اس کو قرار دینا چاہ رہا تھا ایک ایسے انسان کو جسے زندگی میں خوشیاں کم اور غم زیادہ ملے ہوں، جو آدھی زندگی اپنوں کی قربت سے دور رہا۔ جسے پچھتاووں کی آگ نے جھلسا کر رکھ دیا ہو اس کو کم از کم اتنا حق ضرور ملنا چاہیے کہ وہ مرتے وقت ایک آسودہ مسکراہٹ ہی دنیا سے لے جائے۔ اس کے دل نے صمد چچا کی خواہش کا احترام کرنے کا درس دیا۔

اسی رات ہاسپٹل کے روم میں چند گواہوں کی موجودگی میں اس کا اور ورشا کا نکاح ہو گیا اور صمد چچا تو جیسے اسی آس پر زندہ تھے اسی رات وہ دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اس نے صمد چچا کی موت کی خبر دینے کے لیے پاکستان فون کیا تو پتہ چلا کہ دادی بھی ایک دن پہلے اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ وہ چونکہ ہاسپٹل میں تھا للذا اس کو اطلاع نہ ہو سکی تھی۔ شاید دادی کو پتہ چل گیا ہو گا کہ ان کا انتظار ختم ہونے والا ہے۔

☼ ☼ ☼

صمد چچا کی خواہش تھی کہ وہ دونوں یہاں سے تمام جائیداد فروخت کر کے پاکستان جا کر رہیں۔ لہٰذا پاکستان جانے سے پہلے اسے تمام کاغذی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ ورشا نے تمام ضروری کاغذات اس کے حوالے کر دیے تھے۔ صمد چچا کے بعد وہ مزید اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فاز پر زبردستی مسلط کی گئی ہے اس لیے اس نے فاز کے حوالے سے کوئی خواب یا کسی خواہش کو پروان نہیں چڑھایا۔ اس نے بھی اس رشتے کو محض اپنے مرتے ہوئے باپ کی آخری خوشی کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پاکستان جا کر فاز سے کہہ دے گی کہ جس خاموشی سے یہ نکاح ہوا ہے اسی خاموشی کے ساتھ اسے ختم کر کے فاز اپنی نئی زندگی جو رابعہ کے حوالے سے تھی شروع کر سکتا ہے۔ اسی لیے اس نے فاز سے درخواست کی کہ فی الحال اس نکاح کی خبر پاکستان میں نہیں پہنچنی چاہیے اور فاز جو خود بھی دل میں یہ ارادہ کیے بیٹھے تھا کہ وہ اس نکاح کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے ورشا کی بات پر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس طرح فی الوقت وہ ان مسائل سے بچ جائے گا جو ردعمل کے طور پر وہاں پیدا ہوتے۔

فاز نے کرائے کا فلیٹ خالی کر دیا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ ورشا کو آج بھی اسی مقام پر دیکھتا تھا جہاں کہ کل وہ ورشا کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ بہر حال اب اس کی ذمہ داری تھی۔

اس دن صبح ہی سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ جسم میں درد کے ساتھ فلو کے بھی آثار شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے شام تک وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ وہ عموماً صبح سات بجے گھر سے نکل جاتا تھا۔ جب ساڑھے سات بجے تک فاز نہیں اٹھا تو ورشا آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بے سدھ سویا ہوا تھا۔

"کس طرح سے جگاؤں ....." وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے زور سے دروازے پہ دستک دی۔ فاز نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں اور سامنے ورشا کو کھڑا دیکھ کر انتہائی ناگواری سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ... آج آپ اٹھے نہیں اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو اٹھا دوں۔ ساڑھے سات کا ٹائم ہو گیا ہے۔" وہ اس کے تیور دیکھ کر نظریں چرا گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کہ وہ کسی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر رہی

ہو۔ اسے فاز سے بات کرتے ہوئے ویسے بھی ڈر لگتا تھا کہ نہ جانے کب یہ شخص اسے آئینہ دکھانے کھڑا ہو جائے۔

"تمہیں یہ ذمہ داریاں نبھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے وقت اور معمولات کا خود ذمہ دار ہوں اور ویسے بھی میرا اور تمہارا نکاح صرف کاغذ کی حد تک ہے اس سے زیادہ کی تم امید بھی مت رکھنا۔" اس نے انگلی اٹھا کر خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے اسے اوقات یاد دلا دی۔

تذلیل کے احساس نے اسے یوں جکڑا کہ لگا کہ اگر سانس بھی لی تو ٹکڑوں کی شکل میں زمین بوس ہو جائے گی۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا اسے نہیں پتہ وہ کمرے سے باہر کیسے آئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ لوگ کیسے بغیر جانے بوجھے دوسرے پر فرد جرم عائد کر دیتے ہیں۔ سزائے موت کے مجرم کو بھی ایک ہی بار سولی چڑھایا جاتا ہے مگر یہاں تو لوگ ملزم اور مجرم کا فرق جانے بغیر کئی کئی مرتبہ سولی چڑھا دیتے ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے گناہ گار موجود ہیں مگر یہاں لوگوں نے گناہوں کے بھی پیمانے بنا رکھے ہیں۔ جو دوسروں کا گھر اجاڑ دیتے ہیں۔ دلوں میں نفرتے ڈلوا دیتے ہیں، صبح شام جھوٹ کے نوالے توڑتے ہیں پاکیزہ جسموں کو اپنی ناپاک نگاہوں سے چھلنی کرتے ہیں وہ کیسے پارسائی کا تمغہ سینے پر سجائے گھومتے پھرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے گناہ پوشیدہ ہیں۔ لیکن صرف دنیا والوں سے اوپر جو قادر مطلق ہے جو دلوں میں بھی جھانک لیتا ہے وہ سب جانتا ہے کہ بڑی سزا کا مستحق کون ہے۔ وہ جو ظاہر ہے یا وہ جو باطن میں پوشیدہ ہے۔ وہ چاہے تو بڑے سے بڑے گناہ کو شرمندگی کے چند آنسوؤں سے دھو ڈالے اور نہ چاہے تو پتھروں پر پڑنے والے سجدوں کے نشان سے بھی بے نیاز ہو جائے۔

اس نے تمام جائیداد فروخت کر کے رقم ورشا کے حوالے کر دی۔

"اس پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ تمہاری مرضی ہے تم جیسا چاہو اسے استعمال میں لاؤ۔" یہ کہہ کر فاز نے اس کی گود میں رقم ڈال دی اور فریج سے پانی نکال کر پینے لگا۔

"اتنی بڑی رقم کی میں حفاظت نہیں کر سکوں گی۔ بہتر ہوتا اگر آپ اسے اپنے پاس رکھ لیتے جب مجھے ضرورت ہو گی میں آپ سے لے لوں گی۔"

فاز نے ہاتھ میں پکڑا گلاس فریج پر رکھا اور دونوں ہاتھ جینز کی جیب میں ڈال کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

"ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ جو لڑکی اپنی عزت کی حفاظت نہ کر سکے وہ کاغذ کے ان ٹکڑوں کی حفاظت کیا کر سکے گی۔ بہرحال ابھی تم اسے اپنے پاس رکھو میں کل ان کا چیک بنوا کر تمہارے نام سے یہ رقم پاکستان ٹرانسفر کروا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

وہ کچھ دیر فاز کے منہ سے نکلنے والے آگ کے گولوں سے اپنے آپ کو سینکتی رہی۔ پھر جب حدت اس کے احساس کو جھلسانے لگی تو گھبرا کر واش بیسن میں لگے نل سے چہرے کو پانی اور آنسوؤں سے دھو کر اس کی جلن کو کم کرنے کی سعی میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

اور آج وہ پاکستان جا رہے تھے۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان میں اس کے ساتھ کس قسم کا استقبال کیا جائے گا۔ تاہم فاز کے رویے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی عزت افزائی کے بارے میں کچھ زیادہ خوش امید نہیں تھی۔

اس نے سامنے کھڑے ہوئے اجنبی چہروں پر نظر ڈالی کہ شاید کہیں کسی آنکھ میں اس کے لیے اپنائیت کی ہلکی سی جھلک نظر آ جائے۔ یا شاید کوئی جادو کی چھڑی گھما کر ان تمام لوگوں کے ذہنوں سے اس کی غلطی کو ہمیشہ کے لیے غائب کر دے۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ فاز گو تمام کہانی فون کے ذریعے ان کے گوش گزار کر چکا ہے۔

فاز کی امی نے بیٹے کو گلے لگا کر خوب پیار کیا اور پھر

ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر بولیں۔ ”تم اپنی ماں کے پاس چلی جاتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عورت یہاں ٹپک پڑے اور پھر یک نہ شد دو شد والی بات ہو جائے۔“

اور وہ جو چند رسمی جملے سننے کی منتظر تھی۔ ان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

فاز کی دونوں بہنوں نے البتہ اس سے دعا سلام ضرور کی۔ بلکہ فاز سے چھوٹی ارم نے اپنا اور چھوٹی بہن تانیہ کا تعارف بھی کرایا اور ساتھ ساتھ صمد چچا کے مرنے کی تعزیت بھی کی۔ ایسے موقع پر پاپا کا ذکر ہوتے ہی خود بخود اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ جنہیں چھپانے کے لیے اسے گردن جھکانا پڑی۔

”ارے میرا بچہ آگیا۔“ ایک پرجوش بھاری آواز پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بھاری بھرکم وجود۔ سفید چکن کا سوٹ پہنے اوپر سے کالی چادر اوڑھے وہ اس کے پاپا سے ملتی جلتی خاتون تھیں۔ وہ بے ساختہ دو قدم آگے آگئی۔

”آپ میری پھپھو ہیں نا۔“ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

فاز کا ماتھا چومتی انیسہ بیگم نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں اپنائیت کی ہلکی سی رمق آکر فوراً“ ہی معدوم ہو گئی۔

”ورشا ہو نا تم کیسی ہو۔“ بے حد سرد لہجہ الفاظ منہ سے ادا ہوئے اور فضا میں ہی جم گئے۔

وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ٹھیک ہوں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے جا کر سامنے پڑے تخت پر بیٹھ گئی۔ جیسے لندن سے پاکستان تک کا سفر پیدل کر کے آئی ہو۔ فاز نے ایک لمحے کے لیے اس کا تاریک چہرہ دیکھا اور ارم کو اشارہ کیا۔

”آؤ ورشا چلو اندر چلیں۔ تم چاہو تو شاور لے لو تب تک میں چائے دم دے لوں۔“ ارم نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں کیوں ورشا کی معصوم صورت دیکھتے ہی اسے اپنے دل سے منفی خیالات نکالنے پڑے جو اب تک اس کے آنے سے پہلے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

وہ خاموشی سے ارم کے پیچھے چل دی۔

”یہ میرا اور تانیہ کا کمرہ ہے۔ لیکن آج سے یہ ہم تینوں کا ہو گیا۔“ وہ ہنستی ہوئی ورشا کو بے حد پیاری لگی۔

”تم آرام کرو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ ارم یہ کہہ کر اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

ارم کے جاتے ہی اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بے حد سادہ سا کمرہ جس میں سیلف پرنٹڈ بلو کلر کے پردے پڑے تھے۔ فوم کے دو میٹریس مناسب فاصلے پر برابر برابر ڈالے گئے تھے۔ جن کے درمیان دیوار کے ساتھ کتابوں کی چھوٹی سی ریک تھی۔ دائیں جانب ایک الماری اور اس سے متصل ایک سادہ سا ڈریسنگ ٹیبل۔ فرش پر پردوں کا ہم رنگ کارپٹ بچھا ہوا تھا جو غالباً“ ابھی لیا گیا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میٹریس پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ حالانکہ یہاں صفیہ چچی اور انیسہ پھپھو کا ردعمل حسب منشا تھا مگر پھر بھی اسے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ خاص طور پر پھپھو کی بے اعتنائی پر تو وہ ٹوٹ سی گئی۔ اس نے ہلکے سے آنکھیں موند لیں۔ دو آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے۔

اسے یہاں آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو چلا تھا اور اس عرصے میں وہ تقریباً“ سب ہی سے مل چکی تھی۔ پھپھو کے بچوں میں عاشر اور شازیہ۔ پھوپھا سے بھی وہ بس رسمی طور پر ملی تھی کیونکہ انہوں نے خود بھی کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ رابعہ سے البتہ اس کی اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ فاز سے منسوب تھی للہٰذا شادی سے پہلے وہ یہاں نہیں آسکتی تھی۔

ابتدا میں صفیہ چچی کا رویہ بس واجبی سا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اس کے وجود کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن اب چند دنوں سے شاید وہ اس کے وجود کی عادی ہوتی جا رہی تھیں تبھی انہوں نے اس

کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنا شروع کر دیں تھیں۔ بلکہ ــــــــ اب اس کو "ورشا" کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھیں ورنہ اس سے پہلے تو بغیر مخاطب کیے ہی بات کی جاتی رہی تھی۔
اب وہ پاپا کے متعلق بھی اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ البتہ اس کی ذات کے متعلق یا اس کی ماں کے ذات کے متعلق انہوں نے دوبارہ ذکر کبھی نہیں کیا۔ شاید فاز نے منع کر دیا ہو۔ اس نے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"ورشا چلو تیار ہو جاؤ۔ پھپھو کے گھر جانا ہے۔" ارم نے کمرے میں جھانک کر اطلاع دی۔
"انیسہ پھپھو کے گھر۔" ورشا کے لہجے میں بے ساختگی تھی۔
"ظاہر ہے ہماری تمہاری ایک ہی پھپھو ہیں۔" ارم ہنس کر بولی۔ لیکن انیسہ پھپھو کے سابقہ رویے کو یاد کر کے وہ کچھ آزردہ سی ہو گئی۔
"نہیں ارم تم لوگ جاؤ میں گھر ہی پر ٹھیک ہوں۔" ارم اس کا گریز سمجھ چکی تھی۔
"اپنے آپ کو حقیقت کی دنیا میں لاؤ ورشا۔ یہاں لوگ آسانی سے کسی کی غلطی معاف نہیں کرتے۔ ہاں البتہ مقابل اگر خود مضبوطی سے ڈٹ جائے بے حس بن جائے تو لوگ زیادہ دیر تک دیواروں سے سر نہیں پھوڑا کرتے۔ میرا مشورہ مانو تو تم بھی یہی کرو۔ میں صرف تمہاری کزن ہی نہیں اچھی دوست بھی ثابت ہو سکتی ہوں اگر تم چاہو تو..." ورشا اس کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ لیکن اس کا اعتماد تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکا تھا کسی دوسرے پر اعتماد بحال کرنے میں وقت تو لگتا ہے ہی۔
"چلو اٹھو فوراً تیار ہو جاؤ شاباش ہری اپ۔" ارم نے اسے سوچوں کے بھنور سے نکال کر پیار سے حکم دیا۔ ارم کی باتوں سے اس کے دل پر چھایا غبار کسی حد تک چھٹ چکا تھا۔
اس نے ارم کا دیا ہوا پیرٹ گرین کاٹن کا سوٹ نکال کر پہنا۔ اسی میچنگ کے ایئر رنگ اور ہونٹوں پہ پنک شیڈ لپ اسٹک لگا کر وہ اپنی تیاری مکمل کر چکی تھی۔
"واؤ بیوٹی فل۔ ورشا یہ کلر تم پر کتنا سوٹ کر رہا ہے۔" ثانیہ نے خلوص دل سے تعریف کی۔ "امی ورشا کو دیکھیں" ثانیہ کمرے سے نکلتیں صفیہ سے مخاطب ہوئی۔
"ماشاء اللہ" چادر اوڑھتی صفیہ نے بے ساختہ کہا اور اس کے دل نے ان الفاظ کی گردان پر کتنی ہی دیر تک سر دھنا۔ اتنی سرشاری شاید ہی کبھی زندگی میں محسوس ہوئی ہو۔ زندگی کی یہ انمول گھڑیاں جب دل کی دھڑکنیں زندگی کا پتہ دیں اس کی زندگی میں شاید پہلے کبھی نہیں آئیں۔ اس پل اس نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔
پھپھو کا گھر آ گیا تھا۔ ارم نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"تمہیں رابعہ آپی سے مل کر خوشی ہو گی۔ بہت اچھی ہیں وہ۔" اور پتہ نہیں کیوں اس بات پر دل میں کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ وہ بمشکل مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ پھپھو کے گھر میں داخل ہوئی۔
"اوہو.... آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" عاشر نے والہانہ نظروں سے ورشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ورشا کو اس کی نگاہوں کا اوچھا پن بے حد برا لگا۔
"نہیں عاشر بھائی ہم لوگوں میں سے تو کوئی بھی زیادہ بڑا نہیں ہے۔ تقریباً ایک ہی ہائٹ کے ہوں گے ہم تینوں۔" ثانیہ نے ورشا اور ارم کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"بیوقوف میں قد کی نہیں مرتبے کے لحاظ سے بڑا ہونے کی بات کر رہا ہوں۔" عاشر کی نگاہیں مسلسل ورشا پر تھیں۔ اس نے ثانیہ کے مذاق سے لطف و اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
"اور رتبے کو ناپنے کا آپ کے پاس کون سا پیمانہ ہے۔" اندر سے آتی رابعہ عاشر کو معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کتنے دن کے بعد آئی ہو تم لوگ۔ بھائی کے آتے ہی ہمیں بھول گئیں۔" رابعہ نے تانیہ اور ارم کو گلے لگاتے ہوئے کہا ورشا سے البتہ اس نے رسمی طور پر صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ ورشا کو سبکی کا احساس تو ہوا مگر اگلے ہی لمحے وہ ارم کے سبق پر عمل کرتے ہوئے خود اعتمادی سے مسکرا دی۔ جتنی دیر وہ لوگ پھپھو کے گھر رہے۔ رابعہ گاہے بگاہے کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ عاشر پوری طرح حق میزبانی ادا کر رہا تھا۔

"یہ آج عاشر بھائی بڑے خوش اخلاق بنے ہوئے ہیں خیر تو ہے۔" تانیہ نے اس کی حد سے زیادہ نمائش کرتی ہوئی بتیسی کو دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔

"بھئی جب ورشا جیسے مہمان ہوں تو اتنا خوش اخلاق بننے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے۔" نہ جانے رابعہ نے طنز کیا تھا یا یوں ہی بات کہہ دی تھی۔ تاہم ارم نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا ضرور تھا۔

"ویسے میرے بھائی کو خوب صورت چیزیں اٹریکٹ کرتی ہیں اب دیکھو نا پچھلے دنوں ایک کرسٹل کا شوپیس عاشر لایا تھا۔ مگر وہ گھر لاتے ہی چٹخ گیا اور عاشر نے پھر بھی اسے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ کہتا ہے اس میں بال آگیا تو کیا ہوا خوب صورتی تو سلامت ہے۔"

رابعہ کی نظریں ارم پر سے ہوتی ہوئی ورشا پر جا ٹکیں۔ اس بات پر ورشا کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا کر رہ گیا۔

"ویسے رابعہ آپی ورشا آپی کوئی بے جان "چیز" نہیں ہیں۔" تانیہ کو برا محسوس ہوا وہ رابعہ کے لہجے میں چھپا طنز سمجھ چکی تھی۔

"ارے بھئی تمہاری ماں کا تو کوئی فون وون نہیں آیا۔ پتہ تو اسے چل گیا ہوگا تمہارے یہاں آنے کا۔" انیسہ پھپھو اچانک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"ورشا کی امی کو ہمارا فون نمبر کیسے مل سکتا ہے پھپھو۔" ارم نے ناگواری سے جواب دیا۔ اسے ایک تو پہلے ہی رابعہ کے رویے سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

انیسہ پھپھو نے ایک نظر ارم پر ڈالی اور "ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے" کہہ کر باہر بیٹھی صفیہ کے پاس پاندان سنبھالے چل دیں۔

"اے صفیہ میری بات سنو۔" وہ ایک پاؤں پلنگ پہ اور دوسرا نیچے لٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"تم نے اسے گھر میں رکھ تو لیا ہے مگر ذرا خیال رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے ماں نے میرے بھائی کو جدا کروا دیا تھا ایسے ہی بیٹی بھتیجے کو نہ لے اڑے۔ ایسی لڑکیوں کا کیا بھروسہ۔ جانے دو مہینے کس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہوگی۔ اللہ تو اپنی امان میں رکھیو۔ استغفراللہ" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے گال پیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں باجی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اول تو فاز اس سے بات ہی نہیں کرتا۔ دوسرے ورشا بھی بلا ضرورت فاز کے سامنے آنے سے بھی پرہیز کرتی ہے۔ یہ بات میں نے دس دفعہ نوٹ کی ہے۔ آخر اتنی سمجھ بوجھ تو میں بھی رکھتی ہوں۔ بلکہ سچ پوچھو تو لندن میں رہنے والی لڑکی جس طرح ہمارے سادہ سے گھر میں بغیر ناز نخرے کے رہ رہی ہے مجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔ سچ تانیہ کے ساتھ باورچی خانے میں زمین پر بیٹھ کر کھانا تک کھالیتی ہے اور تو اور ارم سے اور مجھ سے ہاتھوں سے لے کر کام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جہاں میں تانیہ یا ارم کو کسی کام سے آواز دوں۔ جھٹ جی صفیہ چچی کہہ حاضر ہو جاتی ہے۔ ابھی پرسوں ہی ارم کے ساتھ گھر کی جھاڑ پونچھ کروا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ لڑکی کوئی برا کام کر کے آئی ہے۔" صفیہ ورشا سے حد درجہ متاثر نظر آرہی تھیں۔

"ارے یہ سب لڑکے کو پھانسنے کی چالبازیاں ہیں۔ بڑی چلتر باز ہوتی ہیں ایسی عورتیں۔ پہلے ماں بہنوں کو قابو کرے گی پھر خود بخود لڑکا بھی پھنس جائے گا۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ ماشاء اللہ کماؤ پوت ہے اور کیا چاہیے۔" انیسہ بیگم صفیہ کی تعریف پر کھٹک گئیں۔

"اس کو کس شے کی کمی ہے۔ فاز بتا رہا تھا جانے کتنی بڑی رقم بینک میں جمع کروائی ہے ورشا کے نام

سے۔ سب باپ چھوڑ کر مرا ہے۔ پھر بھلا وہ ایسا کیوں کرے گی۔ صورت میں بھی کسی سے کم نہیں اور یہاں ہمارے علاوہ اور کون اس کے ماضی کے بارے میں جانتا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ مل سکتا ہے اسے۔" صفیہ نے نند کی بات کو قطعی طور پر رد کر دیا۔

تاہم رقم کا سنتے ہی انیسہ بیگم کے ماتھے پر لکیروں کا جال بچھ گیا۔ وہ غائب دماغی سے سر ہلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں۔ ویسے بھی وہ ورشا کی خوب صورتی سے خائف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رابعہ بھی ورشا سے کھنچی کھنچی تھی۔

☆ ☆ ☆

"رابعہ... مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔ صفیہ بیگم جس طرح ورشا کی شان میں تعریفوں کا پل باندھ رہی تھیں اس سے تو مجھے کسی اور منصوبے کی بو آرہی ہے۔" انیسہ اپنے اندیشے رابعہ کے سپرد کرتے ہوئے بولیں۔

"تو ایسا کرو ذرا فاز کے دل کی لے۔"

"مگر کیسے وہ تو کبھی ہمارے گھر بھی نہیں آتے۔" رابعہ قدرے شرماتے ہوئے بولی۔

"تو بلانا اسے اپنے گھر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکی فاز پر ڈورے ڈال دے۔"

"امی، مجھے عاشر ورشا کی طرف مائل نظر آتا ہے اور ویسے بھی نہ تو پڑھ کر دیا اور نہ ہی کام کرنے کی طرف اس کا دھیان ہے۔ ایسے میں اگر ہم ورشا سے عاشر کا رشتہ ڈال دیں تو عاشر کی زندگی بھی سنور جائے گی اور میرے سر سے بھی یہ بلا ٹل جائے گی۔" رابعہ نے ماں کو راہ دکھائی۔

انیسہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "آئے ہائے یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہ آیا۔" وہ دل ہی دل میں منصوبے بناتے ہوئے بولیں۔

"فاز انیسہ باجی آئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ جلد از جلد رابعہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔" صفیہ نے سلائی مشین میں دھاگہ ڈالتے ہوئے سامنے بیٹھے فاز سے بات شروع کی۔

"پھر آپ نے کیا جواب دیا۔" فاز نے اخبار لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا فاز سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ اب تم بتاؤ کہو تو دو مہینے بعد کی تاریخ لے لوں۔"

"کیا ہو گیا ہے امی آپ کو۔ جوان بہنیں گھر میں بیٹھی ہیں اور میں ان کی موجودگی میں سر پر سہرا سجالوں۔ کم از کم ارم کی تو کہیں ہو جائے۔" وہ ماں پر بگڑ کر بولا جو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی تھیں۔

کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا۔ کم از کم ارم اپنے گھر کی ہو جاتی۔ پھر بھلے وہ فاز کے ارمان بھی پورے کر دیتیں۔ وہ مزید کوئی بات کیے سلائی میں لگ گئیں اور فاز اخبار کا رول بنائے باورچی خانے کی دہلیز پر بیٹھی ورشا کو دیکھنے لگا جو ارم کی کسی بات پر مسکراتی ہوئی آٹے کے پیڑے بنانے میں مشغول تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس کے چہرے کی تازگی میں بھرپور اضافہ ہو گیا تھا اور طمانیت الگ رنگ جمائے ہوئے تھی۔

"کاش میرا ایک اور بھائی ہوتا۔" ارم نے توے سے روٹی اتارتے ہوئے گویا خود کلامی کی۔

"کیوں بھئی یہ اچانک تمہیں ایک اور بھائی کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔" اس کے قریب بیٹھی ہوئی ورشا حیرانگی سے بولی۔

"اگر میرا ایک بھائی اور ہوتا نا... تو" وہ بولتے بولتے رک کر ورشا کی شکل دیکھنے لگی۔

"تو...؟ تو کیا بھئی۔" ورشا اس کی ادھوری بات پر جھنجھلا کر بولی۔

"تو میں تمہیں اپنی بھابھی بنا لیتی۔" بڑے آرام سے کہہ کر وہ روٹی بنانے میں مشغول ہو گئی۔

بعض اوقات پتہ بھی نہیں چلتا اور کسی کی دعائیں طلب سے بھی پہلے قبولیت کا درجہ پا لیتی ہیں۔ جیسے کہ ارم تھی اور بعض اوقات دعائیں بن مانگے قبول تو ہو جاتی ہیں مگر پھر بھی طلب بنی رہتی ہیں جیسا کہ ورشا کے ساتھ ہوا۔

اس کی آنکھوں میں فاز کا سراپا آگیا۔ جس کے

شہابی چہرے پر ورشا کو دیکھتے ہی چنگاریاں پھوٹ پڑتیں۔ مگر پھر بھی وہ اس کی طلب بنتا جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ کب اس کے دل میں فاز کی محبت کی بیل پروان چڑھی۔ وہ مطلوب ہوتے ہوئے بھی دست طلب بن گیا تھا۔ جب ارم اور تانیہ رابعہ اور فاز کی شادی کے منصوبے بناتیں اس وقت وہ بڑے جبر سے ان کے ساتھ شامل گفتگو ہوتی۔ بار بار اپنے دل کو اس کی اوقات یاد دلاتی۔ مگر وہ خواب جو کھلی آنکھوں میں بھی براجمان ہو گئے تھے ان کا وہ کیا کرتی۔ وہ تو آنکھیں بند کرنے پر کرچیوں کی صورت چبھنے لگتے تھے۔ یہاں آ کر تو فاز نے ضرورتاً بھی اس سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"کوئی گھر میں نہیں ہے کیا۔" جانے کب فاز داخلی دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ مجبوراً اسے ورشا کو مخاطب کرنا پڑا کیونکہ گھر میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور ورشا زینے پر بیٹھی خدا تعالیٰ کی نوازی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کر رہی تھی کہ فاز نے آ کر سوچ کا تسلسل توڑ دیا۔

"تانیہ ہے۔ لیکن وہ سو رہی ہے۔" اپنا حوالہ اس لیے نہیں دیا کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی اہمیت ہوتی تو یہ سوال ہی نہ پوچھا جاتا۔ وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا تانیہ کو اٹھانے چل دیا۔

"تانیہ کالج سے آ کر ابھی سوئی ہے۔ اگر آپ کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے تو میں بھی کھانا نکال کر دے سکتی ہوں۔" وہ باوجود کوشش کے لہجے کو طنز سے مبرا کرنے میں ناکام رہی۔

فاز کے بڑھتے قدم یکلخت رک گئے۔ اس نے گھوم کر ایک نظر اس پر ڈالی اور خاموشی سے چلتا ہوا واش بیسن میں ہاتھ دھونے لگا۔

ورشا کو ایک گونا خوشی کا احساس ہوا۔ اسی سرشاری میں باورچی خانے میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔ ٹرے میں بڑے سلیقے سے کھانا سرو کرنے کے بعد وہ فاز کے پاس چلی آئی۔ فاز اس کے طور طریقوں سے خاصا متاثر ہو گیا تھا۔ اسے ورشا سے اتنی جلدی اس ماحول سے سمجھوتے کی امید نہیں تھی۔ وہ تو اسے ایک بگڑی ہوئی یورپین لڑکی کی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ورشا نے اس کے تمام خیالات کی نفی کر دی تھی۔ اسے اپنی نظر شناسی پہ ناز تھا۔ لیکن یہ بات اب سمجھ آئی کہ کسی کی ذات کے اندر جھانکنا بہت مشکل کام ہے۔ بعض اوقات زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ شخصیت کی دھجیاں ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں اور کبھی کبھی کسی کو پرت در پرت کھولنے کے لیے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے آج بڑے دل سے صفائیاں ہو رہی ہیں۔" تانیہ کو فرش رگڑتا دیکھ کر ورشا نے ازراہ مذاق کہا۔

"صرف صفائی ہی نہیں آج ہر کام دل سے ہو رہا ہے۔" تانیہ نے معنی خیزی سے کچن میں کام کرتی ارم کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بھئی آج کیا خاص دن ہے۔" ورشا ہنستی ہوئی ارم کے پاس چلی آئی۔ جس کے چہرے پر ہزار رنگ کی دھنک پھیلی ہوئی تھی۔

"جی نہیں ابھی تو صرف پروپوزل ڈے ہے۔" تانیہ ورشا کے کاندھے پر چہرہ ٹکا کر بولی جو کچن کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔

"کیا واقعی... کون ہے؟" ورشا خوشدلی سے بولی۔

"جی جناب موصوف انگلینڈ سے آنے والے ہیں۔ گھر والے پہلے ایک بار چکر لگا چکے ہیں۔ مگر اتنے دنوں خاموشی اختیار کرنے کے بعد دوبارہ چلے آئے۔ ظاہر ہے میری پیاری بہن جیسی لڑکی کہیں اور ملی ہی نہ ہو گی۔" تانیہ نے پیار سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے شک۔" ورشا نے سچے دل سے تائید کی۔

"میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔" ورشا ہولے سے ارم کا ہاتھ دبا کر بولی۔

"تانیہ۔" صفیہ چچی کی گونجدار آواز پر تانیہ اٹھے

قدموں دوڑی۔ ورشا بھی تانیہ کے پیچھے پیچھے چل دی۔
"بات سن تیری زبان کو لگام ہے کہ نہیں۔ جتنا میں چاہ رہی تھی کہ ورشا ان کے سامنے نہ جائے اللہ اللہ کر کے تو کوئی رشتہ ٹھہرا ہے۔ اب ایسے میں اگر ورشا کو دیکھ کر انہوں نے اپنا ارادہ بدل لیا تو پھر...." صفیہ چچی تانیہ کو بری طرح لتاڑ رہی تھیں۔ ورشا کے اندر بڑھتے قدم رک گئے۔
"مگر امی ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ تو ناممکن سی بات ہے۔" تانیہ منمنائی۔
"میں آج فاز کے ہاتھ اسے انیسہ باجی کے گھر بھیج دیتی۔ شام میں مہمانوں کے جانے کے بعد بلوا لیتی۔ کم از کم بات تو طے ہو جاتی۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولیں۔
"دیکھ لینا ورشا کو دیکھتے ہی وہ اپنا ارادہ نہ بدل لیں تو کہنا۔" وہ شاید باہر آ رہی تھیں۔ ورشا جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
اور پھر جب تک ارم کے رشتے والی خواتین واپس نہ چلی گئیں وہ کمرے میں لیٹی رہی اور سوتی بن گئی۔
"بڑا لمبا سوئیں۔" ارم چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات سجائے اس کے پاس آ گئی۔
"ہاں ایسی نیند آئی کہ بس...." ورشا نے نمک پارہ منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا ہوا مہمان گئے۔" ورشا نے انجان بن کر پوچھا۔
"ہاں چلے گئے۔ رشتہ دے دیا ہے انہوں نے اور ساتھ میں لڑکے کی تصویر بھی دی ہے۔ کہہ رہی تھیں وہ جلد آنے والا ہے۔ جب آ جائے گا تو — خود تشریف لائیں گے موصوف۔ بر دکھاوے کے لیے۔" تانیہ ارم کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"بیگم صاحبہ آپ جا کر کچن کی خبر لیں۔ برتنوں کا ڈھیر پڑا ہے دھونے کے لیے۔ یہ خبرنامہ آپ رات کو بھی نشر کر سکتی ہیں۔" ارم نے تانیہ کی چھیڑ چھاڑ کو سمجھتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہائے.... پھر کام۔"

صبح ہوتا ہے شام ہوتا ہے
میرا کام یوں ہی تمام ہوتا ہے

تانیہ نے شعر کو یکسر بدل کر پڑھا۔

☼ ☼ ☼

"شازیہ اگر فاز گھر پر ہوں تو کہنا کہ مجھے فون کرے۔" رابعہ باہر نکلتی شازیہ کے پیچھے آ کر بولی۔
"اچھا بابا اچھا کہہ دوں گی۔" تیسری مرتبہ یہ بات سننے کے بعد شازیہ جھنجھلا کر بولی۔ ویسے بھی امی اور عاشر ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے اسے باہر نکلنے کی جلدی تھی۔
گھر پہنچتے ہی اس نے رابعہ کا پیغام فاز تک پہنچا دیا۔
فاز قدرے حیران ہوتا ہوا فون کرنے کھڑا ہوا۔ کیوں کہ اس سے پہلے کبھی ان دونوں کے درمیان اس طرح کا کوئی سلسلہ نہیں رہا تھا۔
"ہیلو.... فاز بات کر رہا ہوں خیریت تو ہے۔"
"جی بس یوں ہی آپ سے بات کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ آپ تو کبھی فون بھی نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔" رابعہ نے انتہائی پیار سے شکوہ کیا۔
"کیا مطلب اس سے پہلے کون سا ہم نشستیں لگاتے رہے ہیں۔ جو تم بات کرنے کو بے تاب ہو۔" شاید فاز کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔
"نہیں بس میرا مطلب ہے۔ میرا بہت دل کر رہا تھا بات کرنے کو اس لیے...." رابعہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"اگر کوئی خاص بات ہے رابعہ تو مجھے بتاؤ ورنہ مجھے یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں۔" فاز کو جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی۔ ویسے بھی وہ رومینٹک فلموں تک سے الرجک تھا۔
"ہاں ہاں اب آپ کو ہم کہاں اچھے لگیں گے اتنے حسین اور دولت مند مہمان جو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔" رابعہ نے لہجے میں لاڈ سمو کر فاز کو اپنی طرف

مائل کرنا چاہا۔
"کیا بکواس ہے یہ اور یہ تمہیں ہوا کیا ہے' دماغ تو نہیں پھر گیا تمہارا۔" فاز نے قدرے درشتگی سے اسے لتاڑ دیا اور فون پٹخ کر چلا گیا۔
"فاز کیا سو رہے ہو۔" صفیہ نے بیٹے کا بازو ہلا کر پوچھا۔
"ہوں..... نہیں تو کیوں؟" فاز نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر پوچھا۔
وہ انیسہ باجی اور شہزاد بھائی آئے ہیں۔ ورشا کا رشتہ لے کر۔ تم وہیں آجاتے تو اچھا تھا۔"
"ہیں..... ورشا کا رشتہ لے کر؟" فاز حیران ہو کر اٹھ بیٹھا۔
"آپ چلیں میں آتا ہوں ابھی۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
"ارے بھئی کہیں نہ کہیں تو اس لڑکی کی شادی ہو گی ہی۔ تو میرے عاشر میں کیا برائی ہے۔" انیسہ پھپھو بڑے زور و شور سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔
"ہاں بھئی اور کیا۔ گھر کی بات ہے گھر ہی میں رہے گی۔" شہزاد پھپھا نے ہاں میں ہاں ملائی۔
"لیکن پھپھو ہم ورشا سے پوچھے بغیر یہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔" فاز نے قطعی انداز میں کہا۔
"لو جی ابھی بھی ان کو اتنی عزت دی جائے گی۔ جو اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔" انیسہ پھپھو کو ورشا سے پوچھنے والی بات ذرا نہ بھائی۔
"دیکھیں پھپھو ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ وہ کوئی جاہل لڑکی نہیں ہے۔ خود مختار ہے۔ میں نے کہا نا اس سے پوچھ کر جواب دے دیں گے۔" فاز کو پھپھو کا انداز بہت برا لگا۔ "ویسے بھی آپ جب تک عاشر سے کہیں کہ وہ کوئی کام وغیرہ ڈھونڈے تاکہ ورشا کو بتایا جا سکے کہ عاشر برسر روزگار ہے۔" فاز نے بڑے طریقے سے انہیں بیٹے کی ہڈ حرامی کی طرف متوجہ کیا۔
"اے لو اتنی دولت ہے ورشا کے پاس کیا اپنے شوہر کو کاروبار بھی نہ کروا سکے گی۔"

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔" فاز نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔
"ٹھیک ہے پھوپھو بات کرتے ہیں ورشا سے۔" فاز نے اٹھتے ہوئے بات ختم کر دی۔ انیسہ کسی حد تک مطمئن ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کیوں پسند آئے ہمارے ہونے والے بہنوئی۔" تانیہ نے ورشا کو تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔
"ہوں..... ہاں بہت" ورشا نے بغور تصویر کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
"ویسے نام کیا ہے ان صاحب کا۔" ورشا کی نظریں تصویر پر ہی تھیں۔
"یاور انعام..... انعام ان کے ابا کا نام ہے۔" تانیہ کو ہر بات تفصیل میں کرنے کی عادت تھی۔
"یاور انعام۔" ورشا نے زیر لب دہرایا۔
"نام بھی اچھا ہے' ہے نا ورشا۔"
"ہوں....." ورشا نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
"لاؤ ارم یہ چائے میں اندر لے جاؤں۔" بلیک کلر پر سرخ کڑھائی والے سوٹ میں بال کھولے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ارم اسے دیکھے گئی۔
"لے جاؤ۔" ارم اس کی پر خلوص آفر رد نہ کر سکی۔
صوفے پر براجمان خواتین نے یکے بعد دیگرے اس پر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔
"یہ بچی کون ہے۔" ایک خاتون سے رہا نہ گیا۔
"جی یہ میرے دیور کی بیٹی ہے لندن سے آئی ہے۔" صفیہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولیں۔
"کیا نام ہے بیٹا تمہارا؟"
"جی ورشا' ورشا صمد" اس نے بے حد خوشدلی سے جواب دیا۔
"والد کیا کرتے ہیں۔" دوسری خاتون نے سوال

کیا۔
"جی وہ تو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں اب ہمیشہ کے لیے صفیہ چچی کے پاس آ گئی ہوں۔" اس نے ہنوز معصومیت سے جواب دیا۔
"اور ماں؟" "میرے ابو انہیں چھوڑ چکے تھے۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
"دیکھا۔۔ وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔ لڑکی والوں نے فون کیا تھا۔ کہہ رہی تھیں ہمیں آپ کے دیور کی بیٹی پسند ہے۔ اگر آپ اس کے بارے میں ہمیں جواب دیں تو ٹھیک ہے ورنہ ۔۔۔ یہ کہہ کر کھٹ سے فون رکھ دیا۔" صفیہ کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔
"میں کہتی ہوں تمہیں ضرورت کیا پڑی تھی اسے وہاں بھیجنے کی اور وہ بھی بال وال کھولے مسکراتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔"
"اب اس میں ورشا کا کیا قصور ہے امی۔ مجھے یقین ہے وہ بری نیت سے وہاں نہیں گئی ہو گی اب وہ ہے ہی اتنی پیاری کہ جو بھی دیکھے فوراً پسند کر لے۔" ارم کو اس کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔
"تمہیں خود کو اتنی عقل نہیں تھی۔ یہ مثل مشہور ضرور ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ جاتے چمکتی چیز کی طرف ہی ہیں۔ کیا ضرورت پڑی تھی اس کا ہاتھ چائے بھجوانے کی' منحوس جانے کہاں سے آ گئی منحوسیت ڈالنے۔" صفیہ غصے میں بلبلا رہی تھیں۔ اپنے دل کے پھپھولے کس کے سامنے پھوڑتیں۔ جھٹ نند کو بلوا لیا۔
"ارے میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی جلد از جلد اسے اپنے گھر سے نکالو۔ اگر کہو تو کل ہی منگنی کا انتظام کر لوں۔" انہوں نے ایسے میں اپنی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ آنے دو فاز کو میں آج بات کر کے رہوں گی۔" صفیہ کے غصے کا ٹھکانہ نہیں تھا۔
"میرا خیال ہے فاز آ گیا آواز تو آئی ہے۔" صفیہ جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئیں۔
"کیا بات ہے خیر تو ہے۔" فاز ماں کے ساتھ چلتا ہوا اندر آیا۔
"دیکھو بیٹا جب تک ورشا یہاں رہے گی ہر رشتہ اسی طرح لوٹتا رہے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کے فرض سے بھی ہاتھ کے ہاتھ نمٹ جاؤ۔" انیسہ پھپھو نے بھتیجے کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔
"اگر ان لوگوں نے ورشا کو پسند کر ہی لیا ہے تو اس میں ایسا کون سا غضب ہو گیا۔ یہ تو ہمارے ہاتھ میں ہے کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ کہہ دیں اگر کرنا ہے تو ارم سے کرو۔ ورنہ اپنا رستہ ناپو۔" فاز اکتا کر بولا۔
"تو اگر یہ رشتہ اچھا ہے تو انکار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا عاشر نہ سہی یہ لڑکا سہی۔" انیسہ بیگم کو ان کے ارادے جاننے کا بہترین موقع مل گیا۔ کیونکہ انہیں شک نہیں بلکہ یقین ہو چلا تھا کہ فاز کی نظر ورشا اور اس کی دولت پر ہے۔ جبھی تو رابعہ کو اس بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا تھا فون پر وہ اسی دن سے آگ میں جل رہی تھیں۔
"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا پھپھو کہ ہم ورشا کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ آپ پھر وہی بات کر رہی ہیں۔" وہ جھنجھلا اٹھا۔
"آخر آپ کو پریشانی کیا ہے۔ آپ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔ وہ آپ یا ہم میں سے کسی پر بوجھ نہیں ہے۔ اپنا بار اٹھا سکتی ہے۔ پھر کیوں کبھی عاشر کے لیے زور دیتی ہیں جو نہ پڑھا نہ لکھا نہ کام کاج کرنے والا اور کبھی اس رشتے پر۔" وہ اچھا خاصا تپ گیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی وہ الجھن میں تھا اس کا ضمیر بار بار اسے ورشا کو طلاق دینے سے روک رہا تھا۔ دوسرے یہ نئی مصیبت۔
"نہیں بیٹا۔۔۔ پریشانی مجھے نہیں بلکہ تمہیں ہے۔ میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہارے دوغلے پن کو اس کی دولت دیکھ کر تمہاری نیت بدل رہی ہے۔ ورنہ تم اس کے رشتے کے لیے یوں حیل و حجت نہ کرتے۔"
"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں انیسہ باجی اللہ نہ کرے جو میرے بیٹے کی نیت بدلے۔ نیت جن کی خراب ہے وہ ہی تلملا رہے ہیں۔ ورشا کے لیے۔" صفیہ اپنے

بیٹے پر الزام برداشت نہ کر سکیں۔ انیسہ صفیہ کا اشارہ سمجھ کر سر تاپا سلگ گئی تھیں۔

"ارے تم دونوں ماں بیٹے کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ جبھی میں کہوں جب شادی کی بات کرو ٹال دی جاتی ہے۔ سب سمجھتی ہوں صفیہ بیگم یہ چالتربازیاں۔ ویسے ورشا میں ہزار کیڑے نکل رہے تھے۔ جب سے وہ دولت لے کر آئی ہے تو نام لے لے کر منہ نہیں تھکتا تمہارا۔" وہ غصے میں بڑبڑاتی چادر سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

صفیہ نے اپنا سر تھام لیا۔"ویسے امی پھپھو اور رابعہ آپی مسلسل شک و شبہات میں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھ سے بھی اس دن رابعہ آپی اسی قسم کی باتیں کر رہی تھیں۔" تانیہ ماں کے قریب آ کر بولی۔

فاز نے تانیہ کی بات سنی اور اسے ڈپٹ کر کہا۔

"تانیہ.... تم بڑوں کے درمیان مت بولو۔ چلو اپنے کمرے میں۔"

"اور امی غلطی آپ کی ہے کیا ضرورت تھی ورشا کے بارے میں اتنی معلومات دینے کی کہ وہ کیا لے کر آئی ہے کیا نہیں؟" فاز ماں پر بگڑ کر بولا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ ان کی رال ٹپک پڑے گی۔" صفیہ بھی تن فن کرتیں باہر چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"بڑی نمک حرام لڑکی ہو۔ جس تھالی میں کھا رہی ہو اسی میں سوراخ کرنے لگیں اتنی بھی غیرت نہیں ہے تم میں۔" صفیہ کے جو منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہی تھیں۔

ارم الگ شاک کی سی کیفیت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ورشا ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو ورشا کے ساتھ خلوص کا رشتہ جوڑ بیٹھی تھی اور ورشا نے پل بھر میں اس کے مان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

ورشا کچھ دیر وہیں کھڑی صفیہ چچی کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اپنے اندر بڑھتے قدم روک کر بولی۔

"بہر حال آپ کچھ بھی کہیں میں اس رشتے کے لیے راضی ہوں۔ اگر آپ لوگ انکار کریں گے تو میں خود انہیں فون کر کے ہاں کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے اور تانیہ ارم کے مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔

"کیا ہوا امی کس پر غصہ ہو رہی ہیں۔" اندر آتا فاز ماں کو چیختے دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"ارے پتہ نہیں کس کا گندہ خون ہے یہ۔ اگر صمد کی بیٹی ہوتی تو یوں ہمارے مان کے ٹکڑے نہ کرتی۔ کہتی ہے جو رشتہ ارم کے لیے آیا تھا اور اب وہ میرے لیے کہہ رہے ہیں انہیں ہاں کر دوں۔ میں وہاں شادی کروں گی۔ بتاؤ ذرا بھی غیرت نہیں ہے اس میں۔" اب کے صفیہ رو دیں۔ "میری بچی کے ارمانوں پر دھول جھونک رہی ہے یہ۔"

فاز کے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ وہ ایک لمحے میں اس کے پاس جا پہنچا۔

"مجھے تم سے اس قدر بے شرمی کی توقع نہ تھی۔ تم ایک گری ہوئی لڑکی ہو۔ واقعی میں تمہیں ٹھیک سمجھا تھا تم ایک بد کردار لڑکی ہو۔ جو اپنے کسی فعل پر شرمندہ نہیں ہو سکتی۔" اس نے آرام سے بیٹھی ہوئی ورشا کو دیکھ کر کہا۔

"ظاہر ہے میں ساری زندگی آپ کے نام پر تو نہیں بیٹھی رہوں گی۔" وہ اسی اطمینان سے بولی۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام لگانے کا۔ لیکن اس طرح میری بہن کے خوابوں کو چکنا چور کرنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟ بولو جواب دو۔" وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"کم از کم اس وقت کا تو انتظار کر لیتیں جب میں تم سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیتا اس کاغذ کے ٹکڑے کا ہی احترام کر لیتیں۔ لیکن تم گندی نالی کا کیڑا ہو۔ جو گندگی میں ہی ٹھیک رہتا ہے۔ جو لڑکی اپنی ہوس کی خاطر اپنی عزت کو مٹی میں ملا دے اس سے بھلا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ واقعی مجھے تو تم صمد چچا کا خون بھی نہیں

لگتیں جانے کس......"

"بس کریں خدا کے واسطے خاموش ہو جائیں۔ یوں میرے ماں باپ کو بدنام نہ کریں" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ "میں تو آپ لوگوں کو دھوکے سے بچانا چاہ رہی تھی۔ لیکن آپ نے تو...... میری عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ میں ایسی نہیں ہوں خدا کی قسم..... میں نے کوئی گناہ نہیں کیا" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بول رہی تھی۔

"اچھا تو پھر کیسی ہو؟ دو مہینے کیا حرم میں گزار کر آئی تھیں۔" صفیہ اندر آتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولیں۔

"سننا چاہتی ہیں آپ تو سنیں۔ جب میری ماں مجھے چھوڑ کر گئی تو میں نے اپنا سب کچھ اپنے باپ کو سمجھ کر ماں کو بھلا دیا۔ مگر جب میرے باپ نے دوسری شادی کی بات کی تو میں برداشت نہ کر سکی۔ میں نے اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے پاپا کی ہر بات میں غرض چھپی ہوئی لگتی تھی۔ اس لیے میں ان کی نافرمانی کر کے طمانیت محسوس کرنے لگی۔

میرا دل کرتا میں گھر ہی نہ جاؤں میں دیر تک اپنی دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے لگی۔ ایسے ہی دنوں میں مجھے ایک پاکستانی لڑکا ملا۔ اس نے مجھے اتنے سبز باغ دکھائے کہ میں نے اپنی تمام تر محرومیوں کے نعم البدل کے طور پر اسے قبول کر لیا۔"

وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔ دوپٹے سے آنسو پونچھے اور کھڑی ہو کر بولی۔

"آپ بتائیں صفیہ چچی، جہاں میں پیدا ہوئی بچپن گزارا اگر اس جگہ میں ایسا کام کرتی ہوں تو کیا اس میں میرا کوئی قصور ہے۔ حالانکہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے نکاح کیا تھا اس شخص سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ دل لگی کی خاطر، وقت گزاری کی خاطر میرے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ اصل میں اس کی نظر پاپا کی دولت پر تھی۔ اس نے سوچا میرے توسط سے کچھ تو ہاتھ آئے گا۔ لیکن جب میں نے پاپا کے پاس جانے سے انکار کر دیا تو ایک رات وہ خاموشی سے طلاق نامہ میرے سرہانے رکھ کر چلا گیا اور ایسا گیا کہ کبھی نہ ملا۔"

"چلو یہ کہانی تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا تھا جو یہ بدلہ تم نے ہم سے لیا۔" صفیہ ابھی تک بے اعتباری کی دہلیز پر کھڑی تھیں۔

"یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے فاز صاحب میرے سوال کا جواب دیں اور مجھے بتائیں کیا واقعی میں اتنی گری ہوئی لڑکی ہوں جتنا کہ آپ مجھے سمجھتے رہے ہیں۔" وہ گھوم کر فاز کے قریب چلی آئی۔ جو ساکت لبوں کے ساتھ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"جو کارنامہ بقول آپ کے میں نے انجام دیا۔ اگر وہاں میں اس سے زیادہ برا کام انجام دے لیتی تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔ اس بظاہر ترقی یافتہ مگر ذہنی طور پر پسماندہ معاشرے میں اس طرح کی باتیں عام ہیں وہاں اسکول کی بچیاں اپنی گود میں بچے لیے پھرتی ہیں۔ لیکن میں جو ان تمام بیہودہ روایات سے بچی رہی تو شاید یہ میرے مذہب اور میرے خون کا تقاضا تھا جس نے مجھے اس حد تک پاتال میں گرنے سے بچائے رکھا اس آزاد ماحول میں رہتے ہوئے بھی میں نے ہمیشہ مردوں سے ایک فاصلہ رکھا۔ میرے اندر خود بخود ایک حجاب تھا۔ بچپن میں قرآن پاک کی جو تفسیر میری آیا پڑھ کر سنایا کرتی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مقدس سورتوں اور آیتوں میں عورتوں کی شرم و حیا اور ان کی حدود مقرر کی جانے والی روشنی میں میں نے اپنی راہیں خود متعین کر لی تھیں۔" وہ بغیر رکے متواتر بول رہی تھی جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو۔ فاز کی نگاہیں آہستہ آہستہ جھکتی جا رہی تھیں۔

"میں نے اپنے گھر میں ماں یا باپ دونوں میں سے کسی کو بھی کبھی سجدہ کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن ماما سلطانہ کے آنے کے بعد جب میں نماز پڑھ کر دعا مانگتی تو پاپا بڑے خوش ہو کر پوچھتے ہمارے بیٹے نے ہمارے لیے کیا مانگا اللہ تعالیٰ سے۔

اس وقت میں انہیں کیا بتاتی کہ میں آپ لوگوں

کے لیے فلاح کی راہ مانگتی ہوں میرے دل میں سے آپ کے لیے ہر وقت حی علی الفلاح اور حی علی الصلواۃ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ لیکن میں یہ بات کبھی نہ کہہ سکی۔ میں نے ان سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ انہوں نے مجھے دو متضاد رویوں کا شکار کیوں بنایا۔ کیوں میرے سامنے دو راہوں کے در کھولے۔ کیوں مجھے اپنی منافقانہ تربیت کے زیر اثر رکھا۔ مجھے اپنی ہی راہوں پر چلنے دیتے۔ مجھے وہ لوگ اپنے نقش قدم پر چلاتے یا پھر مجھے ویسا ماحول پرووائیڈ کرتے جس کی مجھے ضرورت تھی۔

لیکن پھر بھی آج یہ بات میں بلا خوف و جھجک کہہ سکتی ہوں کہ میں نے شادی کی تھی۔ جس کا حق مجھے میرے مذہب نے دیا تھا۔ میرا عمل جائز تھا۔ البتہ طریقہ غلط تھا۔

میرا خدا گواہ ہے کہ مجھے اپنے اس جائز اقدام پر بھی شرمندگی ہے۔ میں نے اپنے باپ کا دل دکھایا میری وجہ سے وہ معذور ہو گئے۔ بیمار ہو گئے اور میرا ہی دکھ انہیں مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور لے گیا" وہ ایک مرتبہ پھر گلوگیر ہو گئی۔

"اب میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں نے ارم والے رشتے پر ہامی کیوں بھری۔ صفیہ چچی اس دنیا میں بہت دھوکا ہے۔ ارم اتنی پر خلوص اور سادہ دل ہے کہ وہ اس طرح کے دھوکے برداشت نہیں کر سکے گی۔ آپ کو پتہ ہے جو رشتہ ارم کے لیے آیا تھا وہ میرا سابقہ شوہر ہے۔ یاور انعام اور میں نے ہامی اس لیے بھری کہ میں اس سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جب وہ یہاں آئے اور مجھ سے بطور منگیتر ملے تو اس کی کیا حالت ہو گی یہ میں دیکھنا چاہتی تھی اور پھر میں سب کے سامنے اس دھوکے باز کو آئینہ دکھاتی۔ اس کا اصل چہرہ دکھاتی۔" وہ سنبھل چکی تھی۔

صفیہ چچی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ارم جو دروازے پر کھڑی تھی حیران نظروں سے ورشا کو دیکھ رہی تھی اچانک ہی اس سے آکر لپٹ گئی۔

"میری بہن۔ مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ حقیقتاً" تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" اس نے گلے لگا کر اعتراف کیا۔

دور کھڑا فاز ارم کو قابل رشک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنا غلط رویہ تسلیم کر لیا تھا۔ ایک وہ تھا جس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ورشا سے معذرت ہی کر سکے۔ اپنے خراب رویے کی اور غلط سوچ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم سب زندگی کے منفی رویے پر نظر رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس لیے ہماری ہر سوچ منفی ہوتی ہے۔ ہم بظاہر نظر آنے والی ہر برائی کو برائی ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابھی ہم میں اتنی جرات نہیں ہے کہ ہم مثبت سوچ کو اپناتے ہوئے برائی سے اچھائی کا کوئی پہلو تلاش کر سکیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو شاید ہم میں ایک دوسرے کو معاف کر دینے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے ماحول میں اسیر نظر ہو گیا ہے۔ جس کو زندگی جس رنگ میں بھاتی ہے وہ اپنی نظر کی وسعت وہیں تک محدود کر لیتا ہے۔ اگر کسی کو زندگی کے منفی رویوں پر نظر رکھنے کی عادت ہو تو وہ اپنی ہر سوچ کو ہر مقام پر منفی انداز میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شاید میرا شمار بھی اسی کیٹیگری کے لوگوں میں ہوتا رہا ہے اس نے ایمانداری سے اپنا احتساب کر ڈالا۔

کوئی تو یہاں میری رہائی کا سبب ہو
اس طلسم زماں میں اسیر نظر ہوں میں

لیکن ابھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وقت تلافی باقی تھی۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا ورشا کے قریب آگیا اور خاموشی سے جھکی نظر کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ جسے ورشا نے ایک لمحے میں تھام لیے کہ ان ہی ہاتھوں کو اس کا سائباں بننا ہے۔

✲ ✲